

مشاہدات و معاشرات
قومی اسمبلی میں آئین سازی

نقشہ اعلاست
سمیع الحق



آئین سازی کا کام بالآخر جس بحران کا شکار ہوا، اس کا اندازہ پہلے ہی دن
حزب اختلاف کی ترمیمات کے ساتھ اکثریتی پارٹی کا رویہ دیکھ کر ہوا، مسئلہ اقلیت
اور اکثریت کا نہیں بلکہ ایک خالصانہ اور مغایمانہ جذبہ اور معقولیت پسندی سے
کام لیکر ملک کو ایک ایسا آئین دینے کا تھا جو اپنے اسلامی، جمہوری، وفاقی اور عوامی
پہلو سے پورے ملک کے مصالح اور ضروریات کا کفیل ہو، اسے ۲۵ سالہ طویل مگر
تلمیح تجربات سے سبق لیکر مرتب کیا گیا ہو اور ارکان اسمبلی کی ہر معقول بات کو باہمی
انہام، تفہیم اور غور و فکر سے قبول کر لیا گیا ہو، مگر یہاں ایک ہی بات طے شدہ شکل
میں سامنے آگئی کہ کوئی بات خواہ وہ کتنی اسلامی یا جمہوری کیوں نہ ہو اور کتنی ہی کوئی تجویز
عوام کے ساتھ بلند بانگ دعادی پر پابند بنانے والی ہو اسے نہیں سنا جائے گا اور
یہ شاید محض اس ڈر سے کہ اس طرح حزب اختلاف کو کریڈٹ نہ مل جائے۔ بہر حال
بعد میں کہا گیا کہ یہ ترمیمات نامعقول تھیں۔ اور آئین سازی کے کام میں رکاوٹوں کی خاطر
یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ اس نے ضروری ہے کہ اسمبلی میں پیش کردہ ترمیمات خاص طور سے
حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب اور دیگر حضرات علماء و ارکان کی اسلامی
ترمیمات کا ایک جائزہ لیں۔

آئین کا سلسلہ دوم بنیادی حقوق سے متعلق ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق پر سب سے زیادہ زور اسلام

سنے دیا ہے، مسلمان تو مسلمان غیر مسلم انسانوں کا تحفظ، غلاموں کے حقوق اور رعایات، یہاں تک کہ حیرانات تک کے حقوق اور مفادات کے جزئی سے جزئی احکام اسلامی قانون (نفاذ اسلام) میں موجود ہیں۔ اس بارہ میں نہ تو قوم اور وطن کی تیز ہے، نہ رنگ و نسل اور امیر و غریب کا کوئی امتیاز اور نہ کسی قبا ئی عصبیت کے نام پر امتیازات ہیں۔ مگر ہمارے ہاں بشمول شہرہ وغیرہ تمام دساتیر کے بنیادی حقوق کا موجودہ تصور ان مغربی اقوام سے متعلق لیا گیا ہے۔ جو دھندلہ تر عالمی انسانی حقوق کا پیٹھے ہیں۔ مگر ان کے انسانی مجدد و شرف کی ساری عمارت وطنی، قومی اور دوسرے امتیازات پر ہے۔ امریکہ جو حقوق انسانی کے منشور کا موجد کہلاتا ہے۔ وہاں آٹھ دن کا لے اور گورے قومی اور غیر قومی ملکی اور اجنبی کے نام سے جو انسانیت سمجھ دے کھیلے جاتے ہیں، کس پر مخفی ہیں۔ فلوریڈا کی ریاست میں نصاب تعلیم تک میں گوروں اور کالوں کا امتیاز رکھا گیا ہے۔ امریکہ میں کسی سیاہ فام کو جسٹس عورت یا سفید فام کو جیشی مرد سے نکاح کی اجازت نہیں۔ خواہ اس کے خون میں کسی سیاہ فام کے خون کا بلا حصہ کیوں شامل نہ ہو۔ تقریباً ۱۴ ریاستوں میں ریلوں، بسوں، ہسپتالوں، ٹیلیفون کے کمروں یہاں تک کہ عبادت گاہوں تک میں یہ نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ جاپان اور انگلینڈ کے شاہی گھرانے کے افراد عام انسانوں سے ایک الگ تھلگ مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔ انگلینڈ کے دستور میں یہ بات شامل ہے کہ بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ ہے۔

دوسری طرف اسلام ہے جسکی نگاہ میں ساری مخلوق خدا کا گھرانہ ہے۔ انھیں عیال اللہ۔ لیکن ہماری نگاہ میں اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے مغربی تہذیب سے مستعار بنیادی حقوق کے تصورات پر مشہرتی ہیں۔ اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر بنیادی حقوق کے نام سے آئین کی رہی سہی اسلامیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً موجودہ بنیادی حقوق میں جنس (مرد، عورت) اور مذہب کی تیز کٹے بغیر بر قسم کی ملازمتوں میں مساوات یہاں تک کہ وہ عدالت کا چیت جسٹس بھی بن سکے۔ کلیدی مناصب بھی سنبھال سکے۔ عام مجالس اور مقامات میں داخلہ اور مرد و زن کا اختلاط، تقریر و تحریر کی آزادی کے نام پر اخلاقی اور مذہبی اقدار سے بھی آزادی بر شمس جو چاہے مذہب اختیار کرے مسلم اور غیر مسلم (اہل ذمہ) مرد و زن سب کو تمام شعبہ ہائے حیات میں ایک لاشی سے لگا کر اس طرح کو بہت سی مثالیں اسلام کے عطا کردہ حقوق کی نفی کرتی ہیں۔ اہ آگے چل کر اسلامی قانون کی اہم و نعمات اور تقاضوں کے نفاذ کے لئے سد راہ بن سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتا۔ ۲۔ اسلامی مملکت میں ارتداد اور اس کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ۳۔ غیر مسلموں پر مخصوص

ٹیکس بریوہ دگانے کی گنجائش ہے : ۴۔ غلامی کے بارہ میں مخصوص حالات میں جواز کی گنجائش ہے۔
 ۵۔ عورت محدود اور قصاص جیسے احکام میں حج نہیں ہو سکتی۔ ۶۔ نہ اس کی قصاکشی ایسے امور میں
 معتبر ہے۔ ۷۔ نہ حدود اور قصاص میں اس کی شہادت معتبر ہے۔ ۸۔ نہ وہ کسی اسلامی سٹیٹ کی سربراہ
 بن سکتی ہے۔ ۹۔ نہ کھٹے بندوں مردوں کی تفریح گاہوں اور مخلوط اجتماعات میں آجا سکتی ہے۔ ۱۰۔
 نہ عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔ ۱۱۔ غیر مسلم اور ذمی، قاضی اور جج نہیں بن سکتا۔
 ۱۲۔ نہ وہ اسلامی ٹیکس سازی کرنے والے اداروں مقننہ یا دستور ساز اداروں کا رکن بن سکتا ہے
 بالخصوص جبکہ اسمبلی کو اس امر کا پتہ چلا دیا گیا ہو کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی
 کر رہا ہے۔ اور تاریخ الوقت قوانین کو کتاب و سنت کے دائرہ میں لائے گی، تو کتاب و سنت
 کی تشریح قوانین اسلامی کی ترتیب، کتاب و سنت کے مطالب کا تعین، اسلامی شرعی ضوابط
 فوجداری و دیوانی کی تعبیر کسی مقننہ شرعیہ (اسمبلی) کے غیر مسلم ارکان کی رائے سے کیے کرانی
 جا سکتی ہے۔ ایک شخص جس سبب اسلام کے اساسی معتقدات توحید، رسالت، شریعت کی
 حدود قانون کا معنی نہ ہو اسے اسلام ان باتوں کی تشریح و تعبیر کا حق کب دے سکتا ہے۔ اور
 درحقیقت ایسا کرنا غیر مسلم اقلیتوں سے زیادتی نہیں عین انصاف ہے۔ وہ اگر انہیں اپنے
 عقیدے، مذہب اور نظریہ کے خلاف قانون سازی کرنے پر مجبور کرتا تو یہ ظلم ہوتا۔ موجودہ
 دستور کا مسودہ نہ صرف انہیں یہ حق دیتا ہے، بلکہ حلف و فاداری وغیرہ کے رسمی الفاظ میں
 ان سے اسلامی نظریہ کی بقا و تحفظ کا حلف دلو اگر انہیں نفاق پر مجبور کرتا ہے۔ اور گویا بالبحر اس
 تعمیر کشی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ الغرض اسلام غیر مسلموں کو تبادلی، انتظامی، صنعتی، اقتصادی وغیرہ
 امور میں تو شریک کرتا ہے۔ مگر آئین اور قانون سازی کا حق کبھی نہیں دیتا۔ جو اجتماعی طور پر —
 تفہیم القول علی الخیر — ہے۔

۱۳۔ اور سبب انہیں کسی انفرادی معاملہ میں انفرادی طور پر مسلمانوں پر ولایت خاصہ نہیں
 دی گئی۔ تو پھر اسے اسلامی سٹیٹ پر ولایت عامہ کب دے سکتا ہے؟ جو تمام اہم کلیدی مناصب
 کی شکل میں عدم امتیاز کرنے سے انہیں باطنی ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام ملازمتوں اور انتخابی
 عہدوں میں اس شخص ولایت میں امتیاز ناگزیر سمجھتا ہے، بلکہ موجودہ بنیادی حقوق غیر مسلم اقوام (جو
 مرتدین کو بھی شامل ہیں) کو نہ عروقت عہد استند، وزارت عدلیہ کی سربراہی افواج اسلامی کی
 کان ٹکسٹ طاقتور سپر بھی قدغن نہیں لگاتے۔ ۱۴۔ اسلام کی نگاہ میں کلیدی مناصب پر فائز

ہونا تو بڑی بات ہے کسی غیر مسلم شہری کی مسلمانوں کے خلاف شہادت بھی معتبر نہیں۔ اس بارہ میں صاف اصولی دعوے ہیں۔ لے لیجئے اللہ لا کفر بیننا و بینکم اللہ وینہ سبیلہ۔ خدا کے کافروں کو مسلمانوں پر کسی معاملہ میں بالادستی نہیں دی۔ اور ارشاد خداوندی ہے: لا تتخذوا بطلانہ من دونکم ملایئہ لکنکم خبیالہ۔

الغرض آئین کے بنیادی حقوق نہ صرف ان تمام باتوں کی نفی کر رہے تھے۔ بلکہ دفعہ ۱ ذیل کی تعلیم تو اس حصے کو قرآن و سنت تک پر بالادستی دے رہی ہے کہ کوئی قانون یا کوئی رسم و رواج جو بمنزلہ قانون ہو اس باب میں عطا کردہ حقوق سے تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔ بہر حال بنیادی حقوق کو اسلامی قانون سازی سے ہٹا کر دے اور ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے ارکان اسمبلی کی طرف سے بیشتر ترامیم آئین، اور حکومتی پارٹی کے جہد و مساعمت، حقوریت اور حقانیت پسندی کے دعووں کے باوجود ان کا جو حشر ہوتا سب کے سامنے ہے۔

دفعہ ۱۱ اس دفعہ کا تعلق ملک کے نام اور علاقائی حدود و سرحدیں کے بارے میں تھا۔ اکثر ترامیم اس میں شرقی پاکستان کو شامل کرانے کی محنت مگر حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں نہ پاسے رفتی نہ پاسے ماندن لی سی ہے۔ اس لئے ان ترامیم کو زیر بحث ہی نہ لانے کے لئے ایک ترمیم بی کے ذریعہ اس دفعہ پر بحث منوی کر دی گئی۔ حزب اختلاف نے نہ صرف اس پر شدید احتجاج کیا بلکہ ایران سے کچھ دیر کے لئے بانٹیکاٹ بھی کیا۔

دفعہ ۱۲ میں کہا گیا ہے کہ اسلام پاکستان کا ملکی مذہب ہوگا۔ لازمی بات تھی کہ اب اس کے کچھ تحفظات ہوں گے، اور کچھ تفسیلات، اگر آئین میں اسے ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو یہ ایک بھل عنوان بن کر رہ جاتا۔ مذہب تو انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کسی مملکت کو اس کا پابند بنانے کا مقصد درحقیقت زندگی کے تمام شعبوں کو اس دائرہ میں لانا ہوتا ہے۔ نہ کہ کوئی خوشامیسل لگا کر اند کی متضاد چیزوں کی مہمیں بھی بدل جائیں۔ اس دفعہ کی اہمیت کے پیش نظر چند اہم ترامیم سامنے آئیں۔ پی پی پی کے پرجوش جرمی اور نوجوان باغی میر احمد رضا خاں قصوری کی ترمیم تھی کہ اس دفعہ میں یہ اضافہ ضروری ہے کہ رسم و رواج اس تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔ جو اس آئین میں قرآن و سنت سے کہیں پایا جائے (ترمیم ۳۲) مولانا غلام غوث ہزاروی چاہتے تھے کہ اب جو شخص بھی اسلام کے قطعی احکام کی خلاف ورزی کرے تو ہمارا مستوجب ہوگا۔ مولانا عبدالحکیم کی تحریک تھی کہ اب مملکت اپنے سرکاری مذہب کے تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔ پی پی پی کے اور باغی

میر عبد الحمید جتوئی، مولانا حفص احمد انصاری، جناب تاج الدین، جناب شاہ احمد نورانی، جناب پروفیسر غفور احمد
جناب شرکت حیات، خان، جناب شیر باز خان، انصاری، مولانا صدر الشہید وغیرہ کی ترمیم میں بھی مذہب
کو تعقل و شعور، عقائد اسلام قانون سازی نہ ہونے اور تمام تعلیمات اور ان دفعہ کے مقدمات پھیلے
کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ مولانا مفتی محمود صاحب اور دیگر ارکان جمعیت کے ساتھ شیخ الحدیث مولانا
عبد الحق صاحب کی مشترکہ ترمیم کتاب بھی کہ سورہ آئین کی دفعہ میں ایجنڈا تھا جس کے تحت جو کچھ کہ ملکیت
عنانیت و سب سے گی کہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بکا دیکھ پیدا کرنے والا کوئی قانون یا پالیسی وضع
نہیں کی جائے گی۔ کلیسیا مناصب پر صرف مسلمان فائز ہوں گے کسی مسلمان کی مرتد ہونے کی اجازت
نہیں ہوگی۔ مگر آج دوسری خواندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ترمیم پیش کرنے والوں کے نزاع و خیال میں بھی
نہ تھا کہ اتنی سب سے دوسری ایسی ہیج ترمیم کا خون ہوگا۔ دفعہ واپس رجعت کی اجازت نہ ملنے
پر جب حزب اختلاف نے واکس آؤٹ کیا، تو ابھی یہ لوگ، لابی میں بھی نہیں پہنچے تھے کہ سپیکر
صاحب نے دفعہ واپس کی ترمیم پیش کرنے والوں کے نام اتنی تیزی سے سینے شروع کر کے کہ ایوان
میں بیٹھے ہوئے بعض اراکین بھی اس تیزی کی زد میں آ گئے۔ اب کہا گیا کہ ترمیمیں ساقط ہو گئیں۔ ان
ارکان نے واپس اگر احتجاج شروع کیا کہ ایسی ترمیم کا اسی طرح سے خون کرنا بے انصافی ہے۔ مگر
ان کا سارا وادینا عدالہ تصور ثابت ہوا۔ پھر سب مولانا غلام غوث صاحب جو ایسے مواقع پر واک آؤٹ
کو قبول ان کے الحکم بنیاد سمجھ کر ایوان ہی میں موجود رہتے تھے۔ مگر آج انہیں بھی اس کا صلہ
ملتا اور ایوان میں بدستہ ہوئے اپنی ترمیم سب سے شروع ہو گئے۔

مذہب اختلاف واسطے سننے بھی نہ سکتے کہ ساقط ہو جائے والی ترمیم ان ایسویں نمبر پر پہنچ
گئی تھیں۔ یہ مشترکہ ترمیم تھی۔ سب سے مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے پیش کیا اس پر محمود علی قصوری
غفور احمد انصاری، شرکت حیات، صاحب اور احمد رضا صاحب نے تقریریں کیں دوسری ترمیم مولانا
صدر الشہید نے پیش کی۔ اس کے بعد بھی مفتی محمود صاحب مولانا ہزاروی، محمود اعظم فاروقی، انصاری صاحب
نے تقریریں کیں۔ آج کے اس طرح عمل پر احتجاج کرتے ہوئے اس غور سے کا اظہار کیا کہ ہمارے ساتھ
کوئی کمیٹی کیا جہاز ہے۔ اور یہ ایسی ہے کہ دفعہ واپس فریب نظر کے ساتھ ترمیم ہے۔ مگر اسے آئین
سے اتنی تشدد کی اجازت نہ ملے۔ ستر ترمیمیں سننے کہا کہ بھلا بھی نہیں یہ دفعہ رکھی گئی ہے۔ تو اس کے
تفاسیروں کی رعایت بھی ضروری سمجھی گئی ہے۔ کئی اسلامی اور غیر اسلامی مالک کا حوالہ دیا گیا۔ مثلاً ایران کا
سرکاری مذہب اشاعتی ہر گاہ ہر شاہ کا مسلمان ہونا ضروری ہوگا۔ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جاسکتا۔

دن اسی دفعہ میں شیخ رشید ناسب قائد ایوان کی ترمیم سانسے آئی، کھٹکا تو پہلی خواندگی کے دوران ان کی اس تقریر سے ہو گیا تھا جس میں انہوں نے قیام پاکستان کو معاشی عوامل پر مبنی قرار دیدیا تھا۔ آج ان کی ترمیم پر بھی کہ پاکستان کی معیشت کی بنیاد سوشلزم پر ہوگی۔ استیصال کے خاتمے کے لئے ہر شہری سے اس کی اہلیت کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کام کے مطابق معاوضہ — تحریک سانسے آگئی، اسلامی ورور رکھنے والوں کے دل ڈوب گئے، کہ ادھر مذہب کو سرکاری مملکت بنانے کی دفعہ اور اب مسجد کے زیر سایہ خرابات کی یہ المناک مثال، مخالفت میں زور شور سے تقریریں ہوئیں۔ مولانا ہزاروی، مولانا انصاری وغیرہ نے کہا کہ یہ ترمیم تو دیا چھ اور تہید کی نفی ہے۔ پھر سوشلزم کی تعریف اور سوشلزم پر کب کسی کا اتفاق ہو سکا ہے۔ ایسی مبہم چیز کو آئین میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ مفتی محمود صاحب نے کہا کہ کیا اسلام ایک مکمل نظام سیاست نہیں۔ مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ اتفاق کا یہ راستہ دنیا میں ہمیں رسوا کر دے گا۔ یہ ترمیم مصلحت و فساداری سے فساداری ہے۔ اور خود دفعہ ۲ کا عدم کردہتی ہے۔ اسلام صرف عبادت کا نام نہیں، مکمل عادلانہ نظام حیات ہے۔ نہ سوشلزم نہ سرمایہ داری، نہ کیونرزم، انہوں نے ان اذموں کے بغیر اسلامی دور عروج کی خوشحالی کا ذکر کیا۔ اکثریت کی تلوار سر پر لٹکتی دیکھ کر حزب اختلاف نے حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ اور اس ترمیم کی جگہ کچھ ترمیمیں ایسی پیش کیں کہ کسی طرح سوشلزم کو اپنے کاوانہ فلسفہ سے الگ کر دیا جائے۔ سوشل جنٹ، اسلامی مساوات، اسلامی سوشلزم اور مساوات محمدی کے الفاظ پیش کئے گئے۔ زور دار تقریریں ہوئیں۔ علماء حق سانسے اسکی بھی مخالفت کی۔

مولانا عبدالحی صاحب نے کہا کہ سوشلزم کے ساتھ اسلامی نقطہ نگاہ اور آئین میں اسے جگہ دینا ایسا ہے کہ کنوئیں میں ایک قطرہ پیتھاب سا ادا پانی ناپاک کر دے۔ اور اگر یہ اصطلاح بدل نکلی تو آگے اسلامی شراب، اسلامی جوتا، اسلامی زنا بھی بوجھ پاسکے گا۔

پی پی پی کی قانون رکن نسیم جہاں بھی ایسے موقع پر بعض اسلامی محاکم کا ذکر کرنے لگتی ہیں۔ اور وہاں کے علماء سے یہاں کے علماء کا موازنہ کہ وہ بھی علماء ہیں۔ مگر وسیع الطرف اور یہاں کے اہل علم تنگ نظر ہیں۔ اس کے جواب میں کہا جاتا کہ اصل آئیڈیل قرآن و سنت ہے۔ نہ کہ دیگر محاکم مگر نقاد غاسقہ میں طوطے کی صدا کون سننا ہے۔ بہر حال بحث کے دوران مولانا کوثر نیازی صاحب کی ایک ترمیم سانسے آگئی، کہ معیشت کی بنیاد اسلامی سوشلزم پر ہوگی۔ جو مساوات محمدی کا آئینہ دار ہوگا۔ حزب اختلاف کو تو اسلام اور سوشلزم دونوں کو خوش کر کے ممدوح اطرفین بننا ہی تھا۔ وہ

اگر چاہتے تو اس ترمیم کے بغیر بھی شیخ رشید کی ترمیم منظور کر سکتے تھے۔ مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ اس وقت شیخ رشید کی خواہش سوشلزم پر مبنی ترمیم اس ترمیم کے بغیر منظور نہ ہو سکی۔ مگر آئین کی اسلامی حیثیت کو بہر حال مشکوک اور مجروح بنا دیا گیا۔ اس ترمیم پر بحث اور حزب اقتدار کی تقاریر سے ”اسلامی آئین سازی“ کے بارے میں سرکاری پارٹی کا طرز عمل اور انداز فکر اور بھی نمایاں ہو کر سامنے آنے لگا۔ اگلی تمام دفعات پر بھی بیشتر ترمیم سامنے آتی رہیں۔ اور اکثریت کی ایک ہی حزب سے امت مسلمہ کی امیدیں جمہوریت پسند عوام کے دلوں اور تاریخ کی بے مثال قربانیوں کا خون کر کے خاک میں ملا دی جاتیں۔

تادم تحریر ایک ہزار سے زائد ترمیمات اپنی معقولیت کا لوہا منوانے کے باوجود مسترد ہو چکی ہیں، سوائے دو چار لفظی ترمیم کے جن کا تعلق زبان کی اصلاح تک محدود رہا۔ ایسی اصلاح بھی صرف پی پی پی کی قبول کی گئی ان ترمیمات پر جو بحث و مباحثہ ہوتا رہا اسکی تفصیلات کی کچھ معمولی جھلکیاں اخبارات میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ تاریخ نے بھی اسے اپنے سینے میں محفوظ کر لیا۔ فیصلہ آنے والوں کے ہاتھ میں ہوگا۔

حزب اقتدار ان ترمیمات کو آئین سازی کی راہ میں رکاوٹ سے تعبیر کرتی ہے مگر فیصلہ تاریخ کے ہاتھ میں ہے۔ اس فیصلہ کو ہم مسودہ اور ترمیم کا موازنہ کر کے آج بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ تاریخ پر چمے گی کہ حزب اقتدار اگر متعصب اور غیر مخلص تھی۔ تو آزاد ارکان کی ترمیم کا کیا حشر ہوا۔ اسے بھی چھوڑ کر پی پی پی کے چند با صنیع افراد نے جمہوریت، اسلامی تہذیب اور معاشرہ کے قیام پر مبنی ترمیم پیش کیں، ان کا کیا حشر ہوا۔ اور کیوں عین موقع پر انہیں اپنی ترمیم واپس لینی پڑی تھی۔ تاریخ ان گنی چنی ترمیم کا بھی جائزہ لے گی، جنہیں منظور کرنے کی پستی بڑے زور شور سے کی جاتی۔ مگر جن میں سوائے لفظی اصلاحات، اور تذکیر و تائید کے ہیر پھیر کے اور کچھ نہ ہوتا۔

ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ تمام پیش کردہ ترمیم اسکی تحریک کرنے والوں کی تقریریں اور حزب اقتدار کی جوابی تقریریں اور رد عمل پر تفصیلی روشنی ڈال سکیں، البتہ کوشش کریں گے کہ اسلامی جمہوری اور عوامی فلاح و بہبود کے متعلق اہم ترمیم کا کچھ نہ کچھ ذکر ہو جائے۔

جمعیت علماء اسلام کے دیگر اکابرین کے علاوہ ہر اہم موقع پر شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے بھی تقریباً ایک سو ترمیمیں داخل کیں۔ جہاں ان کی ترمیم ہو۔ تو اس کو بنیاد بنا کر اس کے مترادف ترمیم کو اجمالاً اشارہ کریں گے۔ اسی طرح جمعیت علماء اسلام کی مشترکہ ترمیم کا بھی ذکر

آتا رہے گا۔ اور ساتھ ساتھ دیگر جماعتوں اور آزاد ارکان کی ترمیمات کا بھی ذکر ہوگا، ترمیم کے الفاظ کو تو سین [] میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ترمیم پر بحث و مباحثہ اسمبلی کے دئے گئے نبرات کے مطابق ہو رہا تھا اسی نبرے اسمبلی کے ریکارڈ پر ترمیم آئی اس لئے اسمبلی کے دئے ہوئے نبرات کے ساتھ ترمیم درج کئے جائیں گے۔

دفعہ ۲۱۔ دفعات ۱۷ اور ۱۸ کا اجمالا ذکر آچکا ہے۔ ۱۷ کا تعلق افراد کے ساتھ قانون وغیرہ کے مطابق سلوک کرنے اور کسی ایسے کام پر مجبور نہ کرنے سے ہے جس کے کرنے کا قانون متعاقبی نہ ہو اور نہ ایسے افعال میں مزاحمت ہوگی، جو قانوناً ممنوع نہ ہو۔ مولانا عبدالحکیم کی ترمیم تھی کہ ان دفعات کو قرآن و سنت سے مشروط کیا جائے اگر قرآن و سنت کسی سے تقاضا کرتا ہے۔ تو اسے مجبور کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔

دفعہ ۲۲۔ ملکیت کے آئین سے وفاداری اور قانون کی اطاعت کے بارے میں ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری آزاد رکن نے کہا۔ بشرط یہ ہے کہ (اس طرح قرآن و سنت کے مسئلہ احکام کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو) سردار شوکت حیات، نذرانی صاحب وغیرہ کی مشترکہ ترمیم یہ تھی (کہ قانون انفرادی حقوق کی کسی خلاف ورزی کو عدالت میں زیر غور لائے جانے سے سستی نہیں کرے گا)۔
دفعہ ۲۳۔ یہ ہے کہ آئین کی تفسیح یا اسکی سعی یا سازش سنگین غداری ہے۔ مولانا ظفر احمد

انصاری، محمود علی قصوری، احمد رضا صاحب، پوہدی ظہور الہی صاحب وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں۔ کہ ایسی سرگرمیاں بھی اس کی زد میں آئی چاہئیں، جو بالآخر ملک کی سالمیت ختم کرنے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر منتج ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس دفعہ کو صدر یحییٰ کے دور کے لئے موثر بنا دیا جاتا ہے۔ انصاری صاحب نے کہا، کہ مشرقی پاکستان کا المیہ یکایک نہیں ۱۹۶۵ء کے بعد تمام حالات کا پیدا کردہ ہے۔ تو اصل مسئلہ آئین توڑنا نہیں۔ بلکہ ملک توڑنا ہے۔ مگر یہاں تو ۱۹۶۹ء سے قبل کئے گئے

تمام اقدامات کو ۲۱ میں تحفظ دیکر یحییٰ خان کو تحفظ دیا گیا ہے۔ حالانکہ دستور ایک دن میں توڑا گیا۔ مگر پورے سال کی سازشوں کا نتیجہ ملک توڑنے کی شکل میں نکلا۔ ظہور الہی صاحب نے کہا کہ ذریعہ یا مشیر جس شکل میں بھی جیسے آئین کی مدد کرتے رہے۔ انہیں بھی آئین میں غدار قرار دینے کی گنجائش رکھی جاسکتی۔ مفتی محمود صاحب نے بھی ایسے خیالات کا اظہار سرکاری ارکان نے مخالفت کی۔

دفعہ ۲۴۔ اس کا تعلق بنیادی حقوق کے سنائی قوانین کا عدم ہونے سے ہے۔ مولانا عبدالحق

کی رائے میں قرآن و سنت کو بنیادی حقوق کا معیار بنانا ضروری تھا، نہ کہ خود بنیادی حقوق کو۔ اس لئے ان کی ترمیم ۱۷۷ یہ تھی کہ (الآیہ کہ ایسا قانون، رسم و رواج جو قرآن پاک اور سنت کے مطابق ہو) مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۷۸ بھی بنیادی حقوق کو اصولاً اسلام کے دائرہ میں لانے کی غرض سے تھی۔ جس میں کہا گیا تھا (کہ دفعہ ۱۷۷ کی شق ۱۷۸ کے بعد حسب ذیل نئی شق کا اضافہ کیا جائے کہ۔۔۔ (۳- الف اس باب کا کوئی حکم، امر، قرآن پاک اور سنت کے مطابق قانون سازی میں مانع نہیں ہوگا۔)

اس دفعہ کے ذیلی پیراگراف میں مسلم افواج یا پولیس یا امن عامہ کے ذمہ دار دیگر جماعتوں کو اس دفعہ کے اطلاق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ احمد رضا قصوری، نورانی صاحب، شوکت حیات، پروفیسر غفور احمد صاحب، مزاری صاحب کی ترمیم یہ تھی کہ اس کا تعین کرنا پارلیمنٹ کا کام ہونا چاہئے۔ سردار مولابخش سومرو، احمد رضا، راؤ خورشید علی وغیرہ نیز مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق اور دیگر ارکان جمعیت کی ترمیم ۱۷۹ یہ تھی کہ اس پیرا سے پولیس یا امن عامہ قائم رکھنے والے ادارے حذف کئے جائیں۔ دفعہ ۱۷۷ کی شق ۱۷۸ کا پیرا (ب) آئین کے جدول اول کے احکام کو اس دفعہ سے تحفظ دینے کی غرض سے ہے۔ جدول اول مارشل لا کے جاری کردہ آرڈیننس پر مشتمل ہے۔ اور ایسے فرامین بھی جو نفاذ آئین سے قبل صدر ایوب، صدر یحییٰ اور خود صدر بھٹو کے زمانہ میں نافذ ہوئے جنہیں پارلیمنٹ کی منظوری حاصل نہیں ہوئی۔ ان میں فیملی لاؤ جیسے رسوائے زمانہ آرڈیننس بھی ہیں۔ ایک جمہوری اور پارلیمانی نظام قائم ہو جانے کے فوراً بعد ایسے کالے قوانین کا عدم ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو سکے۔ تو جدول اول کے تمام قوانین کو بھی اسمبلی میں پیش کرنا تھا۔ یہ بھی نہ ہو سکتا۔ تو اسے بنیادی حقوق کی اس دفعہ کے تحت لانا چاہئے تھا۔ جو تناقض ہوتے خود بخود کا عدم ہو جاتا ہے، مگر یہاں ستم بالا ستم یہ ہوا کہ دفعہ ۱۷۷ میں ایک ذیلی شق بڑھا کر جدول اول کو شقات (۱) اور (۲) سے مستثنیٰ قرار دیکر تحفظ دیا گیا۔

اس غرض سے مولانا عبدالحق، مولانا ظفر احمد انصاری، سردار سومرو، احمد رضا قصوری مولانا نورانی، محمود علی قصوری، امیر زادہ خان وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں کہ (دفعہ ۱۷۷ ذیل ۳ شق ۱۷۸ کو حذف کر دیا جائے۔) اس دفعہ کی شق میں کہا گیا ہے کہ آئین میں اگر تصریح ہو تو بنیادی حقوق معطل کئے جاسکتے ہیں۔ اس پر بھی کئی ترمیمیں آئیں۔ ان حقوق کے معطل کئے گئے ناگوں تحفہ ہیات اور مستثنیات کے خلاف حزب اقتدار نے احتجاج کیا۔ محمود علی قصوری سنہ ۱۳۸۷ھ کہ بنیادی حقوق کھانے کا ایک

طریقہ یہ ہے کہ استثنیٰ کی ایک لمبی فہرست لگا دی جائے۔ انصاری صاحب نے کہا کہ ان حقوق کا تعطل جنگ کے علاوہ کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب نے کہا کہ بنیادی حقوق سے تضادم پر رجم درواج اور قانون کا عدم ہو سکتا ہے۔ تو کتاب و سنت کے منافی قوانین کا عدم ہو جانے کی دفعہ بھی اس باب میں رکھی جائے۔ ظہور الہی صاحب نے کہا کہ اس دفعہ کی شق ۱۱۱ قرآن و سنت کے دئے گئے حقوق چھین سکتی ہے۔ اس دفعہ کی تمام ترمیم سترد ہوئیں۔ اور اختیاباً حزب اختلاف کو واک آؤٹ کرنا پڑا۔

دفعہ ۱۱۱ اگر فتاری اور نظر بندی کے تحفظ کے عنوان سے اقناعی نظر بندی کا جواز بھی اس سے مہیا ہو رہا تھا۔ بہت سے ارکان نے ترمیم میں ایسی شقائے حذف کرنے پر زور دیا تھا۔ مفتی محمود صاحب کی مشترکہ ترمیمات میں بعض تشریحی اور اضافی چیزیں بھی شامل تھیں۔ اور شق ۱۱۱ کے الفاظ آٹھ اور بارہ کو چھ اور آٹھ سے بدلنے کا کہا گیا تھا۔ دیگر ارکان کے علاوہ علی احمد تالپور، عبدالغنی خان، میر عذت بخش بنخو، عبدالحمید جتوئی وغیرہ کی بھی ترمیمیں تھیں۔ اور مختلف پیرایوں میں یہ سعی کی گئی تھی کہ یہ دفعہ ہر فرد کو واقعی معنوں میں گرفتاری نظر بندی اور بے جا تشدد سے تحفظ دے سکے۔ مگر کوئی ترمیم منظور نہ ہو سکی۔

دفعہ ۱۱۱ اس کا تعلق غلامی بیگار وغیرہ امور سے ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو غلام نہیں بنایا جائیگا۔ اور کوئی قانون غلامی کو کسی صورت میں رواج دینے کی اجازت نہیں دے گا۔ ان غلامی کے بارہ میں اسلام نے جو نہایت عادلانہ اور حکیمانہ نقطہ نظر اختیار کیا۔ اختیار بھی اس کے قائل ہیں۔ اسلام نے نہ تو غلامی کو فرض ٹھہرایا۔ نہ اس کی ترویج پر زور دیا۔ خاص تنگی حالات اور مقاصد کے پیش نظر اباحت کے درجہ میں بہر حال گہرائش موجود ہے۔ یہ دفعہ خیر القریں کے پورے دور کا مقابلہ پھر کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کے تمام مکاتب میں موجود ذخیرہ احکام پر یکے جانشین قلم پانی پھر رہا تھا۔ اور شرعی حکم کا اظہار بہر حال ضروری تھا۔ اس نے مولانا عبدالحق مدظلہ سے ترمیم کے پیش کی تھی کہ کسی بھی (شہری) کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔ اور کوئی قانون (سوائے اسلامی احکام کے تابع اجازتوں کے) پاکستان میں ————— مولانا غلام غوث کی الگ اور مفتی محمود صاحب کی مشترکہ ترمیم بھی اس دفعہ کی اصلاح سے متعلق تھی۔ اور سب سے ترمیم بحث کے بعد سترد ہوئیں۔

دفعہ ۱۱۱ میں یہ ترمیمیں تھیں کہ کسی شخص کو نہ صرف شہادت حاصل کرنے کی غرض سے بلکہ کسی شکل میں ایذا نہیں دی جائے گی۔ چاہے وہ ثبوت کے طور پر ہو یا سزا کے طور پر۔ نہ اس کی سیاحت

غیر آبرو مندانه، ظالمانہ یا غیر انسانی سلوک روا رکھا جائے گا۔

دفعہ ۱۳ میں یہ ترمیمیں تھیں کہ ہر شہری کو نہ صرف پاکستان میں نقل و حرکت، کی آزادی ہو بلکہ ہر شہری کو پاسپورٹ حاصل کرنے اور ملک سے باہر جانے اور آنے کا حق ہو گا۔ میر غوث بخش بزنجو، امیر زادہ خان، خان عبدالولی خان، محمود علی قصوری وغیرہ نے پاسپورٹ کی آزادی اور سہولتوں پر تقریریں بھی کیں۔ مگر کوئی ترمیم قبول نہ کی گئی۔

دفعہ ۱۴ انجمن سازی اور سیاسی جماعتوں کی رکینیت کے حق کے بارے میں ہے۔ منشی محمود، مولانا عبدالحق مولانا صدر الشہید، مولانا نعمت اللہ وغیرہ ارکان کی مشترکہ ترمیم منٹا یہ تھی۔ کہ (یہ حق سرکاری ملازم نہ ہونے سے مشروط کرنا چاہیے)۔ مولانا عبدالحکیم نے اپنی ترمیم میں (اخلاق اور مفاد عامہ کے ساتھ اسلام کے مسلمہ احکام پر جانے) کا ذکر کیا تھا۔ نورانی صاحب، شوکت حیات، پروفیسر غفور اور مزاری صاحب کی مشترکہ ترمیم میں تھا۔ (کہ ایسی یونین یا انجمن بنانے پر پابندی ہو جس کا پرگرام اور عمل پاکستان کی سالمیت اور نظریے کے خلاف ہو)۔ محمود علی قصوری کی ترمیم تھی کہ کارکنوں کو ٹریڈ یونین بنانے اور معقول اجروں کے تعین کیلئے اجتماعی مذاکرات کے حق کی ضمانت ملنی چاہیے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی ترمیم شرف قبول نہ پاسکی۔

دفعہ ۱۵ اس کا تعلق تجارت کا دوبارہ اور پیشوں کی آزادی سے متعلق تھا۔ مذکورہ ارکان جمعیت کی ترمیم منٹا یہ تھی۔ کہ (ایسے تمام پیشوں یا کاروبار کو اسلام کے احکام کے تابع ہوتا چاہیے)۔ اس پر زور وار بحث ہوئی۔ مولانا مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا ہزاروی وغیرہ نے تقریریں کیں کہ حکومت کو حلال و حرام کا دوبارہ میں تیز کر دینی پڑے گی۔ اور سودی کاروبار، گھونڈ روٹ، شراب، زنا کے پریشوں پر پابندی لگانا ہوگی۔ مگر نور شہید حسن میر کہہ رہے تھے کہ علماء حلال و حرام کے بارے میں بھی متفق نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے علماء سے پوچھنے کی بجائے ہم حلال و حرام کی اس تیز روی میں نہ پڑیں۔ مفتی محمود نے کہا کہ اگر آپ کو اسلام سے جان خلاصی کرنا ہے۔ تو صاف صاف اعلان کر دیں کہ یہ ایک لادینی سیکورسٹیٹ ہے۔ ورنہ یہاں تو حلال و حرام کے صاف پھٹریں گے۔ برہم چر ہو گا۔ یہی بنیاد سے متفق کر دیا جائے گا۔

مولانا ہزاروی کی ترمیم اس فقرہ کے تحت تھی کہ (ایسی تعلیم کسی دوسرے فرقے کے مذہبی بنیاد پر نہ ہو جسے نہ کرے)۔ مولانا نے کہا کہ فرقہ وارانہ باتوں کو رد کرنا حکومت کا فرض ہے۔ پیر زادہ صاحب نے ان ترمیم کے جواب میں کہا کہ قانون کے تحت مذہبی طبقوں کو سکول کھولنے کا حق دیا گیا ہے۔ آئین میں مکمل نہیں، تو قانون میں یہ حق مکمل شکل میں دیا جائے گا۔ مولانا ہزاروی نے اس یقین دہانی پر اپنی ترمیم واپس لے لی مگر مولانا

عبدالحق صاحب نے واپس نہیں لی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آئین میں واضح طور پر یہ ضمانت ملنی چاہیے کہ مسلم تعلیمی اداروں میں تمام لادینی سرگرمیوں اور کیونززم، قادیانیت، مسیحیت، الحاد اور مغربیت کی روک تھام کی جاسکے۔ اور مشنری ادارے اس صورت میں اپنے نظام تعلیم کو چلائیں۔ جب ان کے اداروں میں مسلمان بچے نہ ہوں۔

دفعہ ۱۸ کا تعلق تقویر وغیرہ کی آزادی سے ہے کہ پاکستان کی سالمیت دفاع امن عامہ وغیرہ کے تابع ہر شہری کا یہ بنیادی حق ہوگا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم ۲۲۶ یہ تھی کہ ان مقبوعات میں (اسلام، نظریہ پاکستان اور اکابر اسلام) کا بھی احسان نہ کیا جائے۔ تاکہ کسی شہری کو بنیادی نظریہ اسلام اور اکابر اسلام کی توہین کی اجازت نہ ہو۔ مولانا غلام غوث نے اپنی ترمیم ۲۲۷ میں ”اسلام کی بے حرمتی“ بڑھانے پر زور دیا تھا۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم تو نظر انداز کر دی گئی۔ مگر اسلام کی بے حرمتی کا ذہر بڑی آسانی سے نہیں نکلایا جاسکتا تھا۔ اس لئے بڑی ہوشیاری سے منفی پہلو کو مثبت الفاظ ”اسلام کی عظمت“ سے بدلنے پر مولانا ہزاروی کو راضی کر کے یہ ترمیم قبول کر لی گئی۔ مولانا عبدالحکیم کی ترمیم ۲۲۸ بھی اس قسم کی تھی۔ محمود علی قصوری کی ترمیم میں پریس اخبارات وغیرہ کے حق پر بھی زور دیا گیا تھا۔

دفعہ ۱۹ کا تعلق ہر شخص کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اسکی تبلیغ کرنے سے متعلق تھا جو غیر مبہم طور پر ارتداد کی ممانعت نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ایک حد تک تبلیغ ارتداد کی چھوٹ دے رہا تھا۔ اس پر بڑی گریا گرمی ہوئی۔ منفی محمود کے ساتھ ارکان جمعیۃ کی مشترکہ ترمیم ۲۳۲ شاہ احمد نورانی شریعت حیات، پروفیسر غفور احمد، شیر باز مزاری کی مشترکہ ترمیم ۲۳۴ احمد رضا قصوری، مولانا انصاری وغیرہ کی ترمیم میں کہا گیا تھا کہ مملکتی مذہب کا تقدس ملحوظ رکھا جائے۔ مرتد ہونا اور خلاف اسلام تبلیغ کرنا ممنوع ہو۔ مولانا غلام غوث کی ترمیم ۲۲۳ میں ارتداد کی یہ تشریح بھی شامل تھی کہ مرتد وہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی متواتر حدیث یا ان کی اجماعی توضیح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ (شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۳۵ کے الفاظ یہ تھے۔) (لیکن ایسا حق، انسداد ارتداد سے متعلق کسی قانون پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ بلکہ ایسے افکار و نظریات کی اشاعت پر پابندی عائد کی جاسکے گی۔ جو مملکت کے اسلامی اصولوں کے انہدام کے باعث ہوں۔)

دفعہ ۲۱ اس دفعہ کا تعلق مذہب وغیرہ کے بارے میں تعلیمی اداروں سے متعلق تحفظات سے متعلق تھا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم یہ تھی کہ (کسی تعلیمی ادارے میں) خلاف اسلام تعلیم و تبلیغ کی

اجانت نہ ہوگی۔ لہذا یہ کہ وہ ادارہ غیر اسلامی فرقے کیلئے مختص ہو۔ اس میں مسلمان شہری تعلیم نہ پاتے ہوں۔
دفعہ ۲۳ اس دفعہ کا تعلق جائیداد سے متعلق احکام سے تھا، کہا گیا تو یہ کہ ہر شہری کی جائیداد کا تحفظ کیا جائے گا۔ مگر آگے کئی شکات اور ذیلی دفعات میں یہ سب کچھ مستثنیات تھے کہ حکومت اور پارلیمنٹ بلا روک ٹوک جب چاہے، جس طرح چاہے۔ جائیداد ضبط کر سکتا ہے۔ معاوضہ کا تعین کرے یا نہ کرے یا ملکیت کی تحدید کرے اور شہری کسی عدالت کا دروازہ بھی نہ کھٹکنا سکے۔ یہ دفعہ ایک ایسی سیف برآں ہے جو ملک کے ہر امن پسند شہری کی املاک اور جائیداد پر ٹھکتی رہے گی۔ اور ایک اسلامی سٹیٹ کے شہری ہمیشہ اپنی املاک کے بارہ میں احساس تحفظ سے محروم رہیں گے۔ نہ اس میں جائز اور ناجائز املاک کی تمیز ہے، نہ ظالمانہ استحصال اور غیر استحصال کی اس پر بہت سی ترامیم ہر مکتب فکر سے آئیں۔ خود سرکاری پارٹی کے ارکان سے بھی مولانا عبدالحق کی ترامیم ۲۴۸، ۲۶۳، ۲۵۵ میں دفعہ ۲۳ کی ذیلی دفعہ ۳ کی شق الف۔ مشہ۔ ج حذف کرنے سے متعلق تھیں، کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے جائیداد کے تحفظ سے متعلق دفعہ عملاً کالعدم کر دی گئی ہے۔

مفتی محمود اور اکابر جمعیت کی مشترکہ ترمیمیں مولانا انصاری، مولانا نورانی، چوہدری ظہور الہی، راجہ نور شید علی کی ترامیم بھی ان دفعات کو حذف کرنے سے متعلق تھیں۔ البتہ نیپ کے جناب امیر زادہ خان کی ترمیم یہ تھی، کہ جائیداد حاصل کر لینے کی صورت میں شہریوں میں امتیاز نہ برتا جائے۔ محمود علی قصوری کی ترمیم صرف دفعات کی ترتیب بدلنے سے متعلق تھی۔ نفسِ مضمون سے انہیں اتفاق تھا۔ شق ۳ کے پیرا (پ) کے آخر میں اضافہ کرانے کے بارہ میں مولانا عبدالحق مدظلہ کی ترمیم ۲۵۵ یہ تھی کہ استثناء صرف اس صورت میں ہونا چاہئے کہ (کوئی قانون جو غیر اسلامی ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت یا جائیداد کو اس کے اصل مستحقین "جائز مالکان" کو واپس کرنے کے لئے وضع کیا جائے گا) مقصد یہ تھا کہ جبری ضبط صرف حرام اور ظالمانہ دولتوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ بھی بحق سرکار نہیں۔ بلکہ اصل حقداروں تک پہنچانے کی غرض سے ذیلی دفعات مالکان کو کسی عدالت عالیہ میں معاوضہ کے بارہ میں شکایت کا حق بھی بھین رہی ہیں۔ اس کے بارہ میں مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۲۶۳ داخل کرائی تھی۔ (کہ دفعہ ۲۳ کی شق ۳ کو حذف کر کے یہ شق بڑھادی جائے کہ (۱) ذیلی شق ۳ کے تحت ادا کردہ کسی معاوضہ کے مناسب ہونے سے متعلق کسی تنازعہ کا فیصلہ عدالت عالیہ اپنے ابتدائی اختیارات سماعت کے تحت کرے گی)۔ مگر جائیداد کی ضبطی کی یہ دفعہ ۲۳ بڑے بڑے و خردوش سے سرکاری پارٹی نے نہ صرف تالیفوں کی گونج میں منظور کرائی۔ بلکہ جب آگے چل کر

شراب نوشی، بھوا، قمار، زنا، فحاشی وغیرہ سے متعلق بھی اگر ترمیم آجاتی، تو سرکاری پارٹی کے بعض ترجمان اسے اسی دفعہ کو ان سب خرابیوں کے مداوا اور زہر کے تریاق کے طور پر پیش کرتے۔ کہ اب اس دفعہ سے سب خرابیاں ختم ہو جائیں گی۔

بسوخت عقل زیرت کہ این چہ بلو العجبی است

یہ دفعہ احمد رضا تصوری کو ایوان سے نکالنے کا سبب بن گیا۔ اور لوگوں کے ہاں اور بانیاد کو پھینکنے کا قانونی حق حاصل کر لینے پر سرکاری پارٹی کے ارکان پانچ منٹ تک کھڑے ہو کر بیچ بجاتے رہے۔

دفعہ ۲۵ | اس کا تعلق شہریوں میں مساوات سے ہے کہ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہیں، محض جنس کی بناء پر کوئی امتیاز نہیں۔ اس کے علاوہ عورتوں کے تحفظ کے لئے مملکت خصوصی انتظامات بھی کر سکتی ہے۔ یہاں بھی شرعی حدود اور امتیازات کا لحاظ ضروری تھا۔ اس لئے مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۴۶ یہ تھی (کہ تمام شہری کی بجائے الفاظ "اسلام کے احکامات کے تابع تمام شہری") شامل کئے جائیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۲۴۷ تھی کہ (ماسوائے اس کے جس کی اسلام نے اجازت دی ہو)۔ مولانا غفر احمد انصاری کی ترمیم ۲۴۸ میں کہا گیا تھا۔ (کہ ماسوائے ان معاملات کے جو قرآن و سنت واضح طور پر مصرح ہیں)۔

دفعہ ۲۶ | یہ ہے کہ تمام مقامات میں داخلہ سے متعلق جنس، ذات، مذہب یا وطن کی بناء پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہ دفعہ جنس یعنی مرد و عورت کو عام مجامع، مجالس اور تفریح گاہوں وغیرہ میں بے محابا اختلاط، مخلوط تعلیم، مخلوط تفریح جیسی تمام باتوں کو آئینی حیثیت دے رہا تھا۔ جبکہ اسلام نے حجاب، پردہ اور عدم اختلاط پر لازمی زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ترمیم ضروری تھیں۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم ۲۴۸ میں کہا گیا تھا۔ کہ (اس دفعہ میں یا فحاشی اور بداخلاقی کی روک تھام کیلئے) امتیاز برتنے کی گنجائش رکھی جائے۔ مولانا غفر احمد انصاری نے یہ مقصد اپنی ترمیم ۲۴۹ میں الفاظ (امن عامہ اور اخلاقیات کے ماسوا) سے حاصل کرنا چاہا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس دفعہ کی مشق ۲۵۰ عورتوں کو خاص انتظامات کئے جانے کو اپنی ترمیم ۲۵۱ میں اس طرح مشروط کرنا چاہا۔ (کہ عورتوں کو عام تفریح گاہوں میں جانے کی اجازت نہ ہوگی)۔

دفعہ ۲۷ | جس کا مقصد یہ ہے کہ ہر قسم کی ملازمتوں اور انتخابی عہدوں میں نسل، مذہب، جنس ذات وغیرہ کی بناء پر امتیاز نہیں کیا جائے گا۔ یہ دفعہ بھی مردوں عورتوں نیز مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز ختم

کہ رہا تھا۔ جبکہ کسی اسلامی سٹیٹ میں غیر مسلموں کو ملک کی بقا و استحکام و سلامتی نیز مقناذ قیام عدل جیسے کلیدی مناصب پر گز نہیں دئے جاسکتے۔ کہ ایسا کہ ناتو ملک کی بھڑائی ہے۔ نہ کوئی کافر شرعاً ولایت عامہ پر فائز کیا جاسکتا ہے۔ عورتوں کو بھی ہر قسم کی ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ٹھہرانا فطرت سے مقابلہ ہے۔ مساوات کے نام سے قدرت کی پیدا کردہ استعداد اور قوت کا تفاوت ختم نہیں کر دیا جاسکتا۔ اور نہ مساوات کے نام پر اسلام غیر مسلموں کو نازک ترین ذمہ داریوں میں شریک ٹھہرا کر سٹیٹ کی بنیادوں پر تیشہ چلا سکتا ہے۔ مرزائی ریشہ دوانیاں ہمارے پیاسے ہیں۔

معرض اس وسیع الظرفی کا نمایاں پورا عالم اسلام مختلف شکلوں میں بھگت رہا ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو سر طغرائیہ کرد وزارت خارجہ سے ہٹانے کے لئے بالآخر عظیم جانی قربانی دینی پڑی۔ ایم ایم احمد کیوجہ سے ہم اقتصادی تباہی کا شکار ہیں۔ اور ان کا وجود مشرقی پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں نفرت کا ذریعہ بنا۔ ایسے کلیدی مناصب کا تحفظ نہایت ضروری تھا۔ پھر یہ دفعہ اپنے عمومی لحاظ سے نہ صرف کافروں بلکہ عورتوں تک کو ملک کی صدارت تک پر فائز ہونے کا جواز پیدا کر رہا تھا جس کا ذکر بعد میں عورتوں کی صدارت کا ذکر آنے پر پیر زادہ صاحب نے خود بھی کیا۔ اور اس دفعہ کے پاس کئے جانے کے بعد اس کا حوالہ دیا گیا۔ کہ اب عورتوں کو بھی صدر بننے کا حق مل گیا ہے۔

پھر مل یہاں بھی فریضہ حق ترمیم کی شکل میں ادا کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود مولانا عبدالحق اور دیگر ارکان جمعیت کی مشترکہ ترمیم ۲۰۰۴ء میں کہا گیا تھا کہ اس میں الفاظ "ماسوائے کلیدی آسامیوں کے" شامل کئے جائیں۔ اسی مقصد کو ملحوظ رکھنے والی دوسری ترمیم مولانا عبدالحق کی مستقل ترمیم تھی۔ چونکہ اسی دفعہ کی مشق میں خود یہ استثناء کی گئی تھی کہ کسی مخصوص عہدے اور ملازمت کے مفاد میں ایک مجلس کے افراد کے لئے تخصیص کی جاسکتی ہے۔ تو مولانا عبدالحق مدظلہ نے اپنی ترمیم ۲۰۰۹ء میں جو بھی اضافہ کرنا چاہا کہ ایک مجلس کی طرح کسی (خاص مذہب) یا مذہب کے افراد کی جانب سے مناسب طور پر یا (اسلام کی رو سے) بھی تخصیص ہوتی چاہئے۔ چونکہ دینی ظہور الہی نے اپنی ترمیم ۲۰۰۹ء میں کہا تھا کہ (سیاسی نظریات یا وابستگیوں) کی وجہ سے بھی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔

پالیسی کے رہنما اصول

بنیادی حقوق کا حصہ دفعہ ۲۸ پر ختم ہوا۔ آگے دفعہ ۲۹ سے آگے عملی یعنی پالیسی کے رہنما اصول کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ جبکہ حیثیت محض ایک خوشامبورڈ یا جسٹس منیر کے الفاظ میں کسی پارٹی

کے انتہائی غشہ اور دماغی جیسی ہوتی ہے۔ جسکی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ نہ اسے کسی عدالت میں چیلنج کرایا جاسکتا ہے۔ عوام کے معاشی، سماجی اور فلاحی بہبود نیز اسلامی طریق زندگی، علاقائی تقصبات کی حوصلہ شکنی، سماجی برائیوں، شراب، بچہ، قمار، عصمت فروشی کے خاتمہ کی کوششوں کا کچھ ذکر بڑی قیودات اور مبالغات کے ساتھ کیا بھی گیا ہے۔ تو وہ آئین کے اسی غیر آئینی حصہ میں جبکہ عوام کی معاشی سماجی اور فلاحی اصلاح ان کا بنیادی حق اور حکومت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ اس فیاضی کا مظاہرہ اسی سے قبل کے دساتیر میں بھی ہے۔ مگر دستور کے اس حصہ میں محض عوام کے فریب نظر کے لئے۔ اسی لئے نہ تو اس پر عمل کرایا جاسکا۔ نہ معاشرتی اور سماجی برائیوں کے خاتمہ کے لئے قدم اٹھ سکے۔ پھر جو حکومت روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لیکر برسرِ اقتدار آتی ہے۔ اس کا تو فریضہ اولین ہے۔ کہ ان بنیادی ضروریات کو بنیادی حقوق میں اولین مقام دیا جائے۔ مگر یہاں بنیادی حقوق میں نہ تو روٹی، کپڑا اور مکان کا ذکر ہے، نہ بنیادی طبی امداد، تعلیم دینا کرنے کی ذمہ داری لی گئی ہے۔ نہ بے روزگاری سے متعلق یا عارضی خلاصی کو شہریوں کی بنیادی حق سمجھا گیا ہے۔ نہ صحت کشوں اور کارکنوں کو ٹریڈ یونینوں کی مراعات، ملازمت کے گھنٹوں کی تعداد، کام کی مقدار، منافع میں کارکنوں کی شرکت وغیرہ کا ذکر ہے، نہ کسی اور طرح مزدوروں اور غریب عوام کی اقتصادی اور معاشرتی فلاح یا ملک کی سماجی اور معاشرتی خرابیوں کے ازالہ کا ذکر ہے۔

بنیادی حقوق سے متعلق ۲۲ دفعات میں ایسا معنی سے معنی چودہ دروازہ بھی بڑی احتیاط سے بند رکھا گیا ہے، جس سے گزرتے ہوئے اسٹیٹ کے خلاف کسی عدالت عالیہ میں اپنے ان بنیادی حقوق اور ضروریات کی فریادیں کر سکیں۔ بخلاف اس کے اسلام عوام کی معاشی اور سماجی حالت مدحارنے اور شہریوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات دینا کرنے کا اس حد تک ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ فرمایا: کہ اگر ملک کے دوسرے حصے میں فرات کے کنارے کوئی کتابی بھوک کی دہر سے مر گیا۔ تو مجھ سے باز پرس ہوگی۔ سو مائتہ اکلہ علی شط الفرات۔ جو حاکم مکان عمر مسعودؓ اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؓ نے ایسے الفاظ کسی غدارش زدہ اونٹ کو دوائی نہ ملنے کے بارے میں کہے، لیکن یہاں جب بنیادی حقوق میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی تو بڑی جرات اور دھمکانی سے پالیسی کے رہنما اصول کا حوالہ دیکر ایسی تمام ترامیم کو مسترد کر دیا گیا۔ جسے قبول کرنا کسی اور کا نہیں۔ تو مسادات محمدی، عوام اور سوشلزم سے بھی خوشنما الفاظ کو اور دھما بچھونا بنانے والوں کا لازمی فریضہ تھا۔ اس کے باوجود کہا جا رہا ہے کہ حزب اختلاف سرمایہ داری کے تحفظ

عوام کے استحصال اور ان کی سماجی اور معاشی بہبود کی مخالفت میں یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ مگر اب ٹوہد کو پیش کردہ مجوزہ متفقہ بارہ نکاتی ترامیم میں ایسی ترامیم بھی سامنے آگئی ہیں۔ جو ترامیم پیش کرنے والوں کے استحصال کے تحفظ کی نہیں بلکہ آئین کے ذریعہ ان چیزوں کے استحصال کی ضمانت دینے کی خواہشات کی کھلی شہادت دے رہے ہیں۔ متحدہ محاذ نے بنیادی حقوق سے متعلق متفقہ ترمیم ۲۵ کی شق ۵ میں کہا ہے کہ حکومت کو ارتکاز دولت ختم کرانے ہر فرد کو خوراک، لباس، مکان، طبی امداد فراہم کرنے کی ذمہ داری بنیادی حقوق ہی میں لینا چاہئے۔ اس طرح کارکنوں کو اجتماعی سود سے باز رہنے، ہڑتال، اعتدائی نظربندی اور مقدمہ چلانے بغیر کسی کو قید نہ کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے (جنگ ۲۵ مارچ متفقہ ترامیم)

مگر اس سے کیا ہوتا ہے، جو لوگ عوام کے ان بنیادی حقوق کے لئے اسمبلی کے اندر اور باہر بے جگری سے لڑ رہے ہیں۔ ان پر رجعت پسند اور استحصالی گروہ، سرمایہ داروں کے ایجنٹ اور اس قسم کی ایک بھتی کس دینے پر یہ سارے مسئلے خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اور عوام کو جنت الحقاد کی تمام نعمتیں خود بخود میسر آ جاتی ہیں۔

بہر تقدیر بنیادی حقوق کا حصہ ختم ہونے پر آئین میں اس غلط کوپڑ کرانے کی متعدد ترمیمیں سامنے آئیں۔ شرکت حیات صاحب، ندانی صاحب، پروفیسر غفور احمد صاحب، مزاری صاحب کی مشترک ترمیم ۲۹۷ مولانا مفتی محمود مولانا عبدالحق مدظلہ مولانا عبدالحکیم، مولانا عبدالشہید مولانا نعمت اللہ اور مولوی عبدالحق لورالائی کی مشترک ترمیم ۲۹۷ چوہدری ظہور الہی کی ترمیم ۲۹۸ محمود علی قصوری کی ترمیم ۲۹۹ عبدالحق بلوچ کی ترمیم ۳۰۰ کا تعلق شکلوں میں انہیں باتوں سے تھا کہ قوم کی معاشی، سماجی، دینی، اخلاقی اور معاشرتی فلاح و بہبود سے متعلق دفعات بنیادی حقوق کے حصہ میں بڑھا دینے جائیں۔ اور تو اور ایوان میں پی پی پی کے سرگرم وکیل ملک محمد اختر نے بھی یہ کمی محسوس کی تھی۔ اور ان کی ترمیم ۲۹۸ میں بھی اس قسم کی بہت سی چیزوں کی دفعہ رکھنے کی تحریک کی گئی تھی۔ مگر ان سے اپنی ترمیم واپس کوالی گئی۔ اور دیگر تمام ترامیم مسترد کر دی گئیں۔

دفعہ ۲۹، ۳۰، ۳۱ یہاں سے پالیسی کے رہنما اصولوں کا آغاز کیا گیا۔ اور جن حسین وعدوں کا ذکر ہے۔ مگر اس کے بارہ میں دفعہ ۲۹ اور ۳۰ میں یہ وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔ کہ ان اصولوں کی پابندی کا انحصار وسائل کے میسر ہونے پر ہوگا۔ نیز ان اصولوں کے سلسلہ میں کسی اقدام کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔ اور نہ یہ کوئی قانون یا فعلی اصولوں کے مطالبی ہے یا نہیں۔ اور نہ اس بارہ

میں مملکت یا کسی بیثیت مجاز کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی جاسکے گی۔ ان تمام گنجائشوں کے بعد انصاف کے فروغ، سماجی برائیوں کے ازالہ، اسلامی طریق زندگی اور معاشی، سماجی بہبود کے فروغ وغیرہ کا آغاز بھی کسی ذمہ دارانہ الفاظ کی بجائے اس طرح کیا گیا تھا، کہ مملکت کو شش کر دیا گیا۔
 الخ - ملاحظہ ہو دعوت، ۳۱، ص ۲۶ وغیرہ۔ ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے بھی آئین کے اس حصہ میں خاصی ترمیم آئی اور ذرا تقریریں ہوئیں۔

راؤ خورشید علی نے کہا، کہ ان اصولوں کو اپنانے کے لئے انتظامیہ کو واضح ہدایات ملنی چاہئیں۔ میاں محمود علی قصوری نے پالیسی کے اصولوں کو ردی کاغذ قرار دیا۔ جن پر عمل درآمد کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ شوکت حیات نے کہا، کہ اب ممکن نہ ہو تو ایک محدود عرصہ کے بعد حکومت کو ان باتوں کا پابند بنالیا جائے۔ محمود اعظم خاردی نے کہا کہ ان خوشنام وعدوں کے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتے کیلئے ایک خاص وفد رکھی گئی ہے۔

صاحبزادہ صفی اللہ نے کہا کہ نفاذ دستور کے ۵ سال بعد ان وعدوں کو پورا کیا جائے۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا جب حکومت آرٹیفیسوں کے ذریعہ احکام نافذ کر سکتی ہے تو سماجی برائیوں کا بھی فوری ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر سرکاری پارٹی کے سرکاری وکیل ملک اختر صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ اسی ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں جناب پیرزادہ صاحب نے کہا کہ یہ تو رہنما اصول ہیں۔ انتظامیہ اس کی روشنی میں کام کرے گی۔ مگر اصولوں پر عمل درآمد کا انحصار وسائل پر ہے۔ اب ہم یہاں اس باب سے متعلق اہم ترمیمات پیش کریں گے۔ سردار مولی بخش سومرو نے ترمیم ۱۱ میں کہا، کہ مملکت کا فرض ہوگا کہ یوم آغاز کے پانچ سال کے اندر اندر ان اصولوں کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ الخ ظفر احمد انصاری صاحب کی ترمیم ۳۲ میں ان اصولوں کو دوبارہ عمل لانے کی خاطر مسائل حاصل کرنے کو تعلیم دینے پر زور دیا گیا تھا۔ اور یہ کہ ان وسائل کے لئے تعینات پسندانہ چیزوں میں کمی کرائی جائے۔ وفد ۱۱ میں سردار شوکت حیات اور نورانی صاحب وغیرہ کی شکر ترمیم ۳۱ یہ تھی کہ یوم آغاز سے دس سال ختم ہو جانے کے بعد قانونی چارہ جوئی کا حق ہوگا۔

دفعہ ۱۲ اسلامی طریق زندگی کے سلسلہ میں اسلامی تعلیم کو لازمی قرار دینے، اخلاقی معیاروں کی تعمیل کی فروغ اور زکوٰۃ اوقاف، مساجد کی مناسب تنظیم اور قرآن و سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے کی پہلی فراہم کرنے کے وعدہ کے لئے گئے مولانا انصاری نے ترمیم ۳۱ کے ذریعہ

ان وعدوں میں عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے کا اضافہ کرنا چاہا تھا۔ مگر وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ اور ترمیم پیش نہ کر سکے۔ وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازمی نے اپنی طرف سے یہ ترمیم پیش کی۔ کہ عربی کے فروغ و تعلیم کی کوشش کرنے کا اضافہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ عربی زبان کی اہمیت اور قرآن کریم کی صحیح طباعت کے مسئلے زیر بحث آئے۔ مفتی محمود صاحب، چوہدری ظہور الہی، مولانا عبدالحکیم صاحب اور دیگر حضرات نے نیازمی کی ترمیم کے حق میں زوردار تائیدی تقریریں کیں۔ اور علماء یہ ثابت کر دیا کہ ادھر سے کسی بھی اچھی بات کی تائید اور تحسین سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ یہ ترمیم معقول تھی اور منظور ہوئی۔ مگر معلوم نہیں اس جانب سے سوائے انصاری صاحب کی اس ترمیم کی تمام دیگر معقول ترمیم کو کیوں غیر معقول سمجھا جاتا رہا۔ چوہدری ظہور الہی نے کہا کہ یہ فراخ دلی ہوئی تھی تو پالیسی کے رہنما اصولوں میں کاش بنیادی حقوق جیسی دفعات میں یہ مظاہرہ ہو جاتا۔

مولانا عبدالحق مدظلہ نے اس دفعہ میں زکوٰۃ مساجد اور اوقاف کی تنظیم سے متعلق دفعہ کو اپنی ترمیم ۳۱ سے (اسلامی احکام کے مطابق) پابند کرنا چاہا۔ اور اس پر تقریر کی جو دوسری بلکہ شریک اشاعت ہے۔ پی پی پی کے میاں منظور حسن کے ترمیم ۳۱ میں اسلامی قانون وراثت کو سختی کے ساتھ ملحوظ رکھنے کا ذکر تھا۔ مگر جیسا کہ اب تک ہوتا رہا۔ ایسی اچھی ترمیم داخل کرنے کا سجدہ سہو پی پی پی کے ارکان کو اس کے واپس لے لینے کی شکل میں کرایا جلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نوا۔

خواتین کے بارہ میں اس دفعہ کے بعد اپنا طرز فکر کی پُر جوش ترجمان خاتون نسیم جہاں نئی دفعات رکھوانا چاہتی تھیں۔ کہ نہ صرف بلدیاتی اداروں میں بلکہ عورتوں کا مرتبہ کرنے کی غرض سے عورتوں کی خصوصی رضا کارانہ تنظیم کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کی مخالفت میں خود خواتین ارکان نے تقریریں کیں اور اسلامی نقطہ نظر کی زوردار ترجمانی کی۔ یکم شریعہ دہاب ایسے مواقع پر ویسے بھی اسلامی طرز فکر اور اعتدال روی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ پی پی پی کی خاتون ارکان کی مخالفت اگرچہ حزب اقتدار کی ہدایات پر تھی، تاکہ نسیم جہاں سے ترمیم واپس کرالی جائے۔ مگر پھر بھی اس شرع اسلام کی ترجمانی کی خیر کا پہلو نکل ہی آیا۔ ویسے بھی جیسا کہ وزیر قانون وغیرہ نے کہا، کہ سبب آئین میں پہلے سے عورتوں کے ساتھ بڑی فیاضی رکھی گئی ہے، تو اب مزید جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ شریعہ دہاب نے کہا کہ اسلام اور مذہب کے فہمہ ہیں اتنی مراعات مل سکتی ہیں، جو مغربیت سے نہیں سمجھتے تھے تو خواتین کو کچھ دیا ہی نہیں۔ ہمارے لئے اپنا مضابطہ سیاست کافی ہے۔ ایسے مسائل میں دوسری اقوام اور ملکوں کو مثال میں پیش نہیں کرنا چاہیئے۔ ضرور اقدس نے عورتوں کو جو بلند مقام دیا، کسی نے

اتنا نہیں دیا۔ پاکستان کو اشتراکی ممالک کی پیروی کی ضرورت نہیں، نہ ہمیں کمیونسٹوں کی نقل کرنی چاہئے۔ مسز زگس نعیم پی پی پی نے نسیم جہاں کی مخالفت میں کہا کہ ہم پاکستانی عورتوں کو غیر ملکی عورتوں کی ایسی باتوں کی نقل نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کی بجائے انہیں اسلام اور اپنی روایات کو اپنانا چاہئے۔ دوسرے دن مولانا عبدالحق مدظلہ نے اپنی تقریر میں نسیم جہاں کی خواتین کے لئے مجوزہ رضا کارانہ تنظیموں کے بارے میں کہا کہ اگر خدا نخواستہ عورتوں کی ایسی رضا کار تنظیمیں آج بھارت کے قبضہ اور قید میں ہوتیں تو بہار کیا حشر ہوتا۔ اور خواتین افواج کے ہاتھوں ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔ احمد رضا قصوری ایک طرف مذہبی معاملات میں بڑے پرجوش ہیں۔ دوسری طرف یہاں انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مکمل شمولیت کی ترمیم پیش کی۔ یہ تضاد یا تو ان کی جذباتی طبیعت کا کرشمہ تھا۔ یا پھر ذہنی ناپختگی تاہم دینی معاملات اور اسلامی ترمیم میں ان کا کردار آخر تک قابل تحسین رہا۔

اس کے بعد دفعات ۳۲، ۳۳، ۳۴ مسودہ سے نامعلوم وجوہات پر حذف کر دی گئی ہیں۔ جھنگ کے مولانا محمد ذاکر صاحب جو بوجہ ضعف بہت کم ہی ایوان کی کارروائی میں حصہ لیتے ہیں۔ نے دفعہ ۳۱ میں اپنی ترمیم کی مناسبت سے اپنے پرسوز اور دردمندانہ جذبات کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اگر آئین میں اسلام کے تحفظ کے لئے واضح شوق رکھ دی جاتیں، تو ترمیموں کی نسبت ہی نہ آئی اب اگر ترمیم واضح ہو، نیت درست ہو تو کسی ترمیم پر رائے شماری کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ ایک نازک صورت حال ہے۔ ہم ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر اب بھی نتائج سے سبق نہ لیا گیا، تو ہمیں اس کا دردناک خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ شیخ رشید کی اصنافی ترمیم کہ سوشلزم معیشت کا مادر ہوگا۔ اتنا بڑا ظلم ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ قرآن مکمل ضابطہ حیات ہے۔ تو ازم کی کیا ضرورت۔ انہوں نے کہا۔ میں چند دن اور جائزہ لے رہا ہوں، اصلاح نہیں ہو سکتی۔ تو آخری اقدام کر کے استعفیٰ پیش کر دوں گا۔ کیونکہ اس صورتحال میں میں اس اسمبلی میں بیٹھنا گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔

دفعہ ۳۵ | شہریوں میں علاقائی، نسلی، قبائلی، صوبائی عصبیتوں کی حوصلہ شکنی کے بارے میں ہے۔ محمود علی قصوری چاہتے تھے کہ اس اہم دفعہ کو بنیادی حقوق میں منتقل کیا جائے۔ انصاری صاحب کی ترمیم تھی کہ ان عصبیتوں میں بدترین عصبیت لسانی بھی ہے۔ اسے بھی دفعہ میں جگہ دی جائے۔ انہوں نے سندھ وغیرہ کے لسانی فسادات کا ذکر کیا۔

دفعہ ۳۶ | اس کا مقصد قومی زندگی کے تمام شعبوں میں عورتوں کی مکمل شمولیت کو یقینی بنانے

کے اقتدار کے بارہ میں ہے۔ انصاری صاحب کی ترمیم تھی کہ (اگر ایسا کرنا اسلامی اقتدار اور اسلامی احکامات کے خلاف نہ ہو) بعد میں ۳۹ کی شق (ط) (جس میں عورتوں کو ان کی عمر یا جنس کے لحاظ سے نامناسب پیشوں پر مجبور نہ کرنے کا ذکر ہے) پر تقریر (جو شریک اشاعت ہے) کرتے ہوئے مولانا عبدالحق مدظلہ نے اس کھلے تضاد کی طرف اشارہ کیا۔ اور فرمایا کہ دراصل ہر شعبہ میں مکمل نمائندگی کی بات فطرت کا مقابلہ ہے اور ۳۹ کی مذکورہ شق میں ہم خود تسلیم کر رہے ہیں کہ عورتیں زندگی کے ہر شعبہ میں شمولیت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس لئے دفعہ ۳۹ کی اس کلی ساداست کو مشروط اور محدود کرنا ضروری ہے۔ مگر اتنی واضح بات پر بھی کان دھرنے کی تو فتنہ اکثریت کو کب نصیب ہو سکتی تھی۔

دفعہ ۳۹ | اس میں پسماندہ علاقوں کے پسماندہ طبقات ملک کے تسمی، معاشی مفادات کے فروغ، شراب، بھوا، زنا، غش ادب اور دیگر سماجی برائیوں کے خاتمہ کا ذکر اس آغاز سے کیا گیا ہے کہ مملکت ایسا کرنے کی کوشش کرے گی۔ یہاں مولانا عبدالحق کی ترمیم ۳۳۱ یہ تھی کہ ان ابتدائی سطور کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ (مقتضیات اسلام کے مطابق مملکت کے لئے لازم ہوگا) اور تحریک پر اپنی تقریر میں واضح کیا کہ کوشش اور ذمہ داری لینے میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوشش تو انگریز کے دور میں بھی ہوتی رہی، ۲۶ سال سے بھی ہو رہی ہے۔ علماء منبر و محراب سے ان باتوں کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور الحمد للہ کہ عقائد کی حد تک یہ کوششیں کامیاب رہی ہیں۔ اور معاشرہ ان باتوں کو برا سمجھتا ہے۔ مگر اقتدار لینے کے بعد حکومت کوشش نہیں کرتی، بلکہ عملاً اسکی ذمہ داری ہوتی ہے، کہ اقتدار، قوت، فوج، پولیس، قانون کے ذریعہ ان خرابیوں کا فوری السدو کرے۔

سردار مولا بخش سومرو، غفر احمد انصاری، نسیم جہاں، عبدالعزیز بھٹی نے بھی ”کوشش کرے گی“ کو حذف کرنے کی ترمیمیں پیش کیں۔ عبدالحق بلوچ، احمد رضا قصوری، جناب بزنجو اس دفعہ کو باب اول میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ شاہ احمد نورانی معین رفقاء (شکوہ حیات، پرد فیسر غفور احمد) مزاری صاحب جن کی ترمیمیں مشترکہ ہوتی تھیں، نے مفت ثانوی تعلیم کو کم از کم پانچ سال میں مہیا کرنے پر زور دیا اس دفعہ کی شق (ج) اور (جج) میں عصمت فروشی، قمار بازی اور دیگر سماجی خرابیوں کی روک تھام کا ذکر تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم ۳۲۵ کے ذریعہ اس میں یہ ترمیم کرانی چاہی کہ (جج) - یوم آغاز کے فوراً بعد عصمت فروشی، قمار بازی، مضر ادویات کا استعمال، بخش ادب اور

اشہادات کی طباعت، نشر و اشاعت اور نمائش کی مکمل روک تھام کرے) شاہ احمد نوری کی مشرکہ ترمیم اور نور شید علی وغیرہ کے بھی مشرکات کے بارے میں اسی طرح ترمیمیں تھیں۔ پی پی پی کے میاں منظور حسین صاحب اس میں غش غلیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام بھی شامل کرانا چاہتے تھے۔ مگر کاش کہ حزب اختلاف کے نہیں تو پی پی پی والوں کی ایسی اچھی ترمیم کو تو شرف پذیرائی بخش دیا جاتا۔ مگر ان کے لئے استرداد کا اصول کار فرما رہا تو ان کے لئے استرباع کا کہ ان سے سجدہ سہو کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شراب وغیرہ کی ترمیمات پر نوری صاحب نے تدریجی اقدامات اور کوششوں کے وعدوں سے ۲۶ سال کا عرصہ گزر گیا۔ زرمبادلہ اور معیشت کی بربادی شراب نے نصف ملک کو گنوا دیا۔ مسلمانوں کا کردار بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے متعینہ مدت میں شراب، وغیرہ کی مکمل بندش ضروری ہے۔

راؤ نور شید علی نے کہا کہ ہم شہ دستور پر غصے کیا ہے۔ کہ تمام اصلاحی اقدامات کتاب سنت کی روشنی میں ہوں گے۔ اسلام میں طبی نقطہ نظر کے لئے بھی شراب کی اجازت کی گنجائش نہیں، شریعت نے جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں شفاء رکھی ہی نہیں۔ اگر کوئی شراب پیئے بغیر مر رہا ہے، تو اُسے مر جانا چاہیے۔ اس ارض پاک کو اس کے وجودنا مسعود سے پاک رکھنا ہی بہتر ہے۔ جو لوگ طبی ضرورت اور غیر مسلم کے نام سے استثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں وہ دنیا خود چاہتے ہیں۔ مگر بندوق غیر مسلموں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ یہاں سیاسی مقاصد کے لئے تو اتنی مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ اور جہاں اصلاح معاشرہ کی بات ہو۔ اس میں چور و دواڑے اور رعایتیں پیدا کی جاتی ہیں۔

وزیر خزانہ ڈاکٹر بشیر حسن نے ان تقاریر کے جواب میں وہی استصال والا الہ دین کا چراغ استعمال کیا، اور کہا کہ ان چیزوں کی برائیوں کے بارے میں مجھے ایسے دوستوں سے اختلاف نہیں مگر یہ منزلی حاصل کرنے کے لئے ذرا گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ان تمام برائیوں کی وجہ ہمارے ہاں کا معاشی نظام ہے۔ سودی نظام اکنامک پاور حاصل کرنے کے جذبہ کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور ہم نے تحدید ملکیت اور جائیداد کی ضابطی کی دعوت اسی لئے رکھی ہیں۔ ہم سوشلسٹ معیشت قائم کریں گے تو برائیوں کی جڑ کاٹ جائے گی۔ مولانا عہد الحق کی اس بات کہ میر و محراب پر علماء کا برائیوں کے خلاف سماجی کاغذی حصہ ہے۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بشیر حسن صاحب نے کہا کہ محض میر و محراب اور تبلیغ سے نہیں پوتا۔ کچھ اثر ہوا ہوگا۔ مگر حرج نہیں کئی اور وہ سوشلسٹ معیشت سے چلی جائے گی۔ اس بحث و مباحثہ کے بعد لفظ کوشش کے حذف کرنے سے متعلق ترمیمیں تو منظور کر لی گئیں۔ مگر دیگر تمام اصنافی اور تشریحی ترمیمیں

ساقط ہوئیں۔ اور سمندر سے پائے کو شبنم کا یہ قطرہ ملا بھی تو اس وجہ سے کہ اس باب کی درخواست کے اعتبار سے اور قوم واری کی کوئی قانونی صورت دیکھ بھی نہیں تھی۔ مگر تمام معدودات قائم کرنے اور منکرات مٹانے جیسی بے ہزار دفعہ بھی وعدہ کی شکل میں سہی مگر شامل نہ کی سکی۔
دفعہ ۳۹ میں مولانا عبدالحق صاحب اپنی ترمیم ۲۵۵ کے ذریعہ حسب ذیل نئے پیرے شامل کرنا چاہتے تھے۔

(ج۔ ملک میں مروجہ نظام و نصاب تعلیم کے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرے۔
د۔ قومی اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی زبان کو مسلمانوں کی مشترک دینی زبان کی حیثیت سے فروغ دے۔ ڈ۔ تمام معدودات کو فروغ دے اور تمام منکرات کو مٹائے)
اپنی ترمیم کی تشریح میں مولانا عبدالحق نے کہا کہ ۲۶ سال گزرنے کے بعد بھی انگریزی نصاب و نظام تعلیم کی بدولت انگریزی تہذیب و تمدن اور مغربی طور طریقہ ہم پر مسلط ہیں۔ اس تعلیم کی وجہ سے ذہنیت بدستور غلامانہ ہے۔ اس لئے ہر شعبہ کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا چاہئے۔ زبان کا بھی یہی معاملہ ہے ہزاروں میل دور سے غاصبانہ تسلط جمانے والی قوم کی انگریزی ہم پر مسلط ہے۔ قرعہ عربی جو خدا کی دجی رسول کی زبان اور تمام اسلامی ذخیرہ اور ورثہ کی زبان ہے، کیوں اہمیت کی مستحق نہیں اسی طرح معدودات کو فروغ اور منکرات کا مٹانا اسلامی اسٹیٹ کا حسب ارشاد خداوندی اولین فریضہ ہے۔

مولانا غفر احمد انصاری کی ترمیم یہ تھی کہ پرنسپل لاء یعنی عائلی قوانین کے تنازعات کو اسلامی قوانین کے مطابق حل کرنے کے لئے نشی عدالتیں اور مقدمہ بازی کی جوصلہ شکنی کے لئے مقامی مصالحتی کونسلیں قائم کی جائیں۔

دفعہ ۷۱ | اس میں عوام کی معاشی سماجی فلاح و بہبود سے متعلق اقدامات کا ذکر ہے کہ مملکت ایسے امور کی کوشش کرے گی۔ یہاں بھی ترمیم کے ذریعہ کہا گیا تھا کہ کوشش کی بجائے مملکت کے لئے لازم ہونا چاہئے۔ محمود علی قصوری، ڈاکٹر عبدالحی بلوچ، نرنجود وغیرہ کی ترمیم میں کہا گیا تھا کہ ایسے بنیادی مسائل اور ضروریات سے متعلق دفعہ کو بنیادی حقوق میں شامل کرنا چاہئے۔ روزگار، تعلیم، عسلا راج، وسائل معاش، ہیا کر سنے جیسی بنیادی باتوں کا صرف وعدہ کافی نہیں۔ ہرنجود نے اس میں شریک یونین کی تشکیل، روزگار کی فراہمی، ہر شہری کو مسلح افواج میں شامل ہونے کے حقوق بڑھوانے کا ذکر کیا۔ انہوں نے ترمیم پر کہا کہ اگر ۹ فیصد غریب آبادی کو حقوق نہیں دئے جاسکتے تو وہ آئین قابل قبول

نہیں ہو سکے گا، یہ ملک اس لئے نہیں بناتھا کہ پیپلز پارٹی کے ایجنٹ چند سرمایہ دار وڈیرے غریب عوام کا استحصال کریں۔ شیخ رشید نے ان کے جواب میں کہا کہ یہ لوگ ایک طرف استحصال ختم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف حصول جائداد کی دفعہ کے خلاف ہیں۔ یہ قول اور عمل کا تضاد ہے۔

اس دفعہ کی شق مشہ میں رہا کو عینی جلد ممکن ہو ختم کرنے کا ذکر ہے۔ رہوا جیسی لعنت کا ذکر (دعویٰ کے باب میں اور پھر صرف ”جتنی جلد“ کے الفاظ میں) بعض پچھلے دراتیر میں بھی چلا آ رہا ہے۔ اسی عینی جلد کا تعین ضروری ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے ترمیم ۳۶ء میں تحریک فرمائی کہ (رہوا کو زائد سے زائد تین سال میں ختم کرے اور اس کے لئے ماہرین شریعت و اقتصادیات کی ایک کمیٹی ترتیب دے جو موجودہ بینک سسٹم کو غیر سودی بنیادوں پر اسلامی اصول کے مطابق تبدیل کرے۔)

انصاری صاحب کی ترمیم ۳۶ء میں بھی تین سال اور شوکت صاحب، نورانی صاحب، مزاری صاحب، پرنسپل غفور صاحب کی ترمیم ۳۶ء میں پانچ سال کا تعین کیا گیا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ برسوں سے مسلط سودی نظام کو فوری طور پر تبدیل نہیں کیا جاسکتا تو یوم نفاذ کے بعد اگر ایکسٹنڈ کیٹی اسے اسلامی اقتصادیات کے سانچے میں ڈھانے کا کام شروع کر دے تو تین سال میں اسے مکمل تبدیل کرنا مشکل کام نہیں۔ مولانا نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقتدار دولت اور استحصال ختم کرنے کی دہریہ عوامی حکومت کا تو بہر حال بنیادی فریضہ ہے کہ سود کو کیسر ختم کر دے۔ پھر سودی نظام کے بارہ میں جب تہذیبی طرف سے اعلان جنگ ہے تو بحیثیت مسلمان جلد از جلد اس سے چھٹکارا لازم ہے، ورنہ خطرہ ہے کہ ملک ہی اس لعنت کی وجہ سے ختم ہو جائے۔

غصہ و غلہ فاروقی نے کہا کہ ہم دیگر ممالک سے تو پھاہتے ہیں کہ بغیر سود قرضہ دیا جاسکے مگر اپنے ملک میں سود کی لعنت کیوں ختم نہیں کرتے۔ پی پی پی کے میاں منظور حسین نے اپنی ترمیم ۳۶ء میں بنکاری کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لینے اور سود کی وصولی فوراً بند کر دینے کا کہا تھا۔ مگر سود سے متعلق یہ تمام ترامیم بھی یکجہت مسترد ہو گئیں۔ احمد رضا قصوری نے اس دفعہ کے بعد کارکنوں کو اجتماعی سود بازی، گیارہ اجرت کا حق کارکنوں کی آرام و آسائش کی ضمانت سے متعلق نئی دفعہ بڑھانا چاہی۔ ملک بھر جاگیردارانہ قبائلی اور ذاتی غلاتوں میں عدم سادست دور کرنے سے متعلق نئی دفعہ رکھنا چاہی۔ مگر یہ ترمیمیں بھی مسترد ہو گئیں۔

دفعہ ۱۱۱ یہ دفعہ مسلم ممالک کے ساتھ دوستی کے رشتے مضبوط کرنے اور بین الاقوامی امن کو فروغ دینے سے متعلق ہے۔ انصاری صاحب نے اپنی ترمیم میں اس دفعہ میں کشمیر، فلسطین اور

مشرقی پاکستان کی آزادی، افریقہ اور ایشیا کے مشترک مفادات کی حمایت اور ڈاکٹر عبدالحق بلوچ نے ملین الاقوامی سامراجیت کے خلاف جدوجہد آزادی کی حمایت پر زور دیا مگر یہ دفعہ بھی پیچھے کسی ترمیم کے منظور ہو گئی۔ اس دفعہ پر پالیسی کے رہنما اصول والاباب ختم ہوتا ہے۔ اور سوائے دو ایک لفظی ترمیمات کے اسلامی، معاشی، سماجی امور سے متعلق تمام اہم ترمیم نظر انداز ہو گئیں۔

حصہ سوم۔ باب اول

صدر

اس حصے کا تعلق صدر پاکستان کی اہلیت، مذہب، عمر سے کا انتخاب، حلف اہل سے کی شہرہ اور معارف، سزاؤں کی تخفیف، اسکے اختیارات، صدر کی برطرفی، وزیراعظم کے مشورے پر عمل کر سنے کی پابندی اور چیئر مین یا سپیکر کے صدر کی قائم مقامی وغیرہ امور سے ہے۔

دفعہ ۵۹ | اس دفعہ کے ذیل میں کہا گیا ہے کہ کوئی شخص بجز اس کے صدر کے انتخاب کا اہل نہ ہوگا، جب تک وہ ۴۵ سال کی عمر کا مسلمان نہ ہو اور قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہ ہو۔ یہاں علماء کی طرف سے دو قسم کی ترمیمیں آئیں۔ ایک یہ کہ صدر کی کم از کم عمر ۵۵ سال کی بجائے پالیسی سال کافی ہے۔ دوسری یہ کہ صدر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ تیسری بات کا تعلق صدر کی دینی اور اخلاقی اہلیت سے تھا۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۹۹۱ء اور جمعیۃ العلماء اسلام کی مشترکہ ترمیم ۱۹۹۲ء، مولانا غلام غوث ہزروی کی ترمیم ۱۹۹۳ء میں کہا گیا تھا کہ صدر کیلئے کم از کم پالیسی سال کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے۔ پھر دوسری ظہور الہی اور امیر زادہ خان کی ترمیم میں بھی پالیسی سال کا کہا گیا تھا۔

عزیز نے اپنی تقریر میں زور دیا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق عورت مریدہ مملکت نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ پالیسی سال کی عمر میں انبیاء کرام کو نبوت مل سکتی ہے۔ تو خلیفہ اسلامی کے لئے بھی جو نائب رسول ہوتا ہے۔ یہی عمر کافی ہے۔ اور اس کا مرد ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ذمہ آئین کی نگرانی، دوسری اقوام سے معاہدات، صلح، اسلامی امور کی نگرانی کا فرائض سے مقابلہ افواج کی تنظیم جیسے گرانبار ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے صدر شجاعیت اور مردانگی کا منہر ہونا چاہئے۔ حضور نے فرمایا ہے کہ ایسی قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس کی آئیر عورت ہو۔ مرد ہی صلح افواج کا سربراہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا، اگر ایک خاتون کن کی تجویز کے مطابق فوج میں عورتیں ہوں۔ اور وہ بھارتی

قید میں چلی جاتیں، تو کیا ہوتا۔ بہر حال صنعت ہارک کہ صدارت کی ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی۔
مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا کہ ہم یہ قید لگا کر عورتوں کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ صرف
اسلام کے اصول بیان کر رہے ہیں۔ اگر عورتوں کو برابر ملکیت دینے کی اجازت دی گئی، تو ملک تباہ ہو
جائے گا۔

خود اہل ارکان یکم نسیم جہاں، مسز اشرف عباسی اور مسز زنگس نجیم نے مولانا عبدالحق اور مولانا غلام غوث
ہزاروی کی تقریروں پر احتجاج کیا۔ مسز نجیم نے کہا کہ اگر مولانا ہزاروی نے اپنے الفاظ واپس نہ لے لیں تو ہم
ایران سے واپس آؤں گے۔ مسز جہاں نے کہا کہ مسلم ممالک میں بڑے اونچے پائے کے علماء
موجود ہیں۔ مگر کہیں بھی عورت کے برابر ملکیت دینے کی مخالفت نہیں ہوتی۔ پاکستان کے علماء کیوں
مخالفت کرتے ہیں۔ مولانا غلام غوث صاحب نے جواب دیا کہ دیگر ممالک کے علماء نے اسلامی
کانفرنس کے موقع پر پاکستانی علماء کے اسی جذبہ اجتہاد حق کی تعریف کی ہے۔ یہاں کے علماء جس طرح
فریاد حق ادا کر رہے ہیں۔ وہ دیگر ممالک کے لئے نمونہ ہونا چاہتے۔ مسز اشرف نے کہا کہ یہ تو ہم
بجہ کارہے اس لئے کہ پہلے ہی ایک ہتھیار منظر پر چکی ہے۔ (علماء کی مخالفت ترمیم کے باوجود)
کہ صنف کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں دینا چاہئے گا۔ وزیر قانون نے بھی اپنا وزن عورتوں کے پلٹے
میں ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ سارا بحث و مباحثہ بے سود ہے۔ اس لئے کہ مردوں اور عورتوں کی مساوات
سے متعلق دنیا بھر میں منظور ہو چکی ہیں۔ صدر دستور نے بھی ان کی تائید کرتے ہوئے بحث ختم کرائی۔ اور
تقریبیں مسترد ہوئیں۔

مرد اور عورت کے اس جھگڑے میں یہ بحث پھڑکی کہ پاکستان کی تباہی کا ذمہ دار کوئی صنعت
ہے۔ ایک آواز آئی کہ اس کا ذمہ دار ایک شرابی اور زانی مرد تھا۔ ہزاروی صاحب نے کہا کہ اس شخص کو عورتوں
سے خراب کیا۔ ایک اور آواز آئی کہ ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ سابق صدر یحییٰ کو خراب کرنے والی جنرل
آئی عورت تھی یا کوئی مرد تھا۔ ؟

عدالت اور مرد کی صدارت کے لئے اہلیت کی اس بحث نے کچھ دیر کے لئے اس دور
کو یاد تازہ کر دیا کہ سابق صدر ایوب اور خاتمہ جناح کے انتخابی مرکز کے دوران ملک کے در و دیوار
اس سیاست سے گونج اٹھے۔ اور ان دور کا حکمران آئین سازی میں ایسے اسلامی اصول کو نظر انداز
کر دینے پر پتھن پڑا تھا۔ اور ایوان اقتدار سے دھڑا دھڑا ایسا شریعت شائع کیا جاتا تھا کہ عورت کی
صدارت اسلامی اصول کے منافی ہے۔ بہت سے لوگ جو ان فتوؤں کی پرچار کر رہے تھے، آج

ان ترامیم کو مسترد کر رہے تھے۔ اور بشمول جماعت اسلامی کئی جماعتیں جو اس وقت مسئلے کا جواز ٹھہرا رہی تھیں۔ آج ان ترامیم کے حق میں تھیں۔ اور اس حکمت عملی کا حوالہ سزا شرف عباسی نے یہ کہہ کر دیا کہ مسئلے میں جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔ قیوم بیگ کے پرفیسر خٹک نے بھی خواتین کی حمایت کی۔ اس دفعہ میں اگلی اصلاح اس کی اہلیت کی شرائط سے متعلق تھی جس پر چار شرطیں آئیں۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۹۷۷ء یہ تھی کہ اس دفعہ کی شق ۷۷ میں مذکورہ ذیل نئی شق کا اضافہ کیا جائے کہ (صدر کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ دینی اور دینی علوم میں مہارت، خدا ترسی، دیانت، فرائض کی پابندی اور منکرات سے اجتناب میں عام مسلمانوں سے ممتاز ہو۔)

مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۱۹۷۷ء میں کہا گیا تھا کہ (وہ عام ملکی حالات قومی سیاسیات سے باخبر ہو نیز اسلام کے احکامات کی خلاف ورزی میں مشہور نہ ہو۔) چوہدری ظہور الہی نے ترمیم ۱۹۷۷ء میں کہا تھا کہ (وہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا پابند ہو۔) مولانا محمد ذاکر نے ترمیم ۱۹۷۷ء میں کہا تھا کہ (وہ مثالی چال چلن کا حامل، دور اندیش ہو، اسلامی عقائد کا صریح مخالف نہ ہو۔)

اسلام کے نقطہ نگاہ میں صدر کی ایسی اہلیتوں کا مقام کتنا ہی بنیادی اور ضروری کیوں نہ ہو۔ یہاں دستور نے صدر کو اسلام کا پابند بنانے سے متعلق یہ تمام ترامیم مسترد کر دیں۔

دفعہ ۷۷ کی شق ۷۷ میں ہے کہ صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کے دونوں ایوان مشترکہ اجلاس میں کریں گے۔ چوہدری ظہور الہی کی ترمیم تھی کہ یہ انتخاب دونوں ایوانوں کے علاوہ صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کے مشترکہ اجلاس میں ہونا چاہئے۔ بھارتی آئین میں بھی صوبائی اسمبلیاں خاص تناسب سے صدر کے انتخاب کے لئے نمائندے بھیج دیتی ہیں۔ عبدالحی بلوچ نے کہا کہ اس طرح یہ ظاہر ہوگا کہ صدر پر صوبائی اسمبلیوں کی بھی اعتماد ہے۔ احمد رضا قصوری نے کہا کہ صدر کے ختم اہلیت کے بارے میں یہ ضمانت بھی ضروری ہے کہ اگر وہ سزا یافتہ ہو یا صدر کے عہدہ سے معزول کیا گیا ہو۔ تو صدارت کے انتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔ وزیر قانون نے کہا کہ یہ مقصد صدارت رکن قومی اسمبلی بننے کی اہلیت ضروری قرار دیکر حاصل ہو جاتی ہے۔ دفعہ ۷۷ کا تعلق صدر کے حلف سے ہے۔

دفعہ ۷۷ عہدہ صدارت کی شرائط میں یہ ہے کہ وہ پاکستان کی ملازمت میں کوئی نفع بخش عہدہ نہ سنبھالے۔ مولانا انصاری کی ترمیم تھی کہ (انڈون، ملک یا بیرون ملک) دونوں کی تصریح ضروری ہے۔ اس طرح یہ بھی ضروری قرار دیا جائے کہ آئندہ کیلئے اس کے سیاسی عزائم نہ ہوں تاکہ

اس کی غیر جانبداری ہر شبہ سے بالاتر رہ سکے۔ ظہور الہی صاحب اور انصاری صاحب کی ترمیم یہ بھی تھی کہ وہ اپنی مدت کے دوران یا اس کے بعد بھی ایسا نہ کر سکے۔

دفعہ ۴۸ | اس دفعہ پر بھی محرکے کی بحث ہوئی۔ اس کا تعلق صدر کے معافی وغیرہ دینے کے اختیارات سے ہے کہ وہ عدالت کی دی گئی سزاؤں میں معافی، مہلت، التوا دے سکتا ہے۔ اسے معطل کر سکتا ہے۔ اور اس میں تخفیف بھی کر سکتا ہے۔ چونکہ شریعت اسلامی کی نظر میں ایسا کوئی اختیار صدر کو محدود، قصاص اور حقوق العباد سے وابستہ امور میں حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام کا نظام عدل و انصاف یقیناً مجروح ہو جاتا ہے۔ حدود کی معافی اور تخفیف سے تو حضورؐ نے بھی غلانیہ معذرت ظاہر کی، مگر یہاں غیر اسلامی دساتیر کی تقلید میں صدر کو ایسی تمام سزاؤں کو یکسوخت کا عدم قرار دے سکنے کا حق دیا جا رہا تھا۔ جو صریحاً اسلامی احکام سے منافی تھا۔ اس لئے جیسا کہ ترمیمیں اس غرض سے داخل ہوئیں۔ مولانا عبدالحق کی ترمیم ۴۸ یہ تھی کہ اس دفعہ میں (اسلامی حدود اور قصاص کا استثناء ضروری ہے۔ چوہدری ظہور الہی کی ترمیم ۴۹ یہ تھی کہ (یہ اختیار قرآن و سنت اور اس سلسلہ کے تائید) کے تابع ہو۔ مفتی محمود، مولانا عبدالحق، مولانا صدر الشہید کی مشترک ترمیم ۵۰ یہ تھی کہ (ایسا اختیار محدود و قصاص اور حقوق العباد کے بارے میں اسلام کے مقرر کردہ تعزیرات کے معاملات پر وسعت پذیر نہیں ہوگا۔) مولانا ظفر احمد انصاری کی ترمیم ۵۱ یہ تھی کہ صدر ایسا اختیار اسلامی مشاورتی کونسل سے اسلامی حکم معلوم کر کے استعمال کرے۔ فاروقی صاحب، شوکت حیات، صاحب، آفرانی صاحب، مزاری صاحب کی مشترک ترمیم ۵۲ میں یہ تھا کہ (جہاں اس اختیار کا استعمال قرآن و سنت کی رو سے ممنوع نہ ہو) محمود علی قصوری اور راؤ نور شید علی صاحب صدر کے ایسے اختیارات کو جو ڈیشینل کونسل کے مشورے کے تابع بنانا چاہتے تھے۔ امیر زاہد خان، عبد الحمید خان بٹوئی اس دفعہ کو سرے سے حذف ہی کرنا چاہتے تھے۔

حکیم اور مخالفین نے زور دار تقریریں کیں۔ مولانا عبدالحق نے دھماکت سے اپنا موقف پیش کیا۔ کہ حدود و قصاص جیسے قطعی احکام کی نوعیت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ مولانا غلام غوث ہزاری صاحب نے کہا کہ اس طرح سزایافتہ مجرموں کو سیاسی اغراض سے سزائیں کم یا معاف کرنا سلفہ کا موقع مل جاتا ہے۔ جبکہ قاتل کو مرنے، مقتول کے ورثاء معاف کر سکتے ہیں۔ سر اجزاہد صفی اللہ نے بھی کہا کہ اسلام کے ایسے اصولوں کو ذیبر اعظم یا صدر تبدیل نہیں کر سکتا۔ مفتی محمود نے حدود و قصاص کی مفصل تشریح کی اور کہا چار جرائم زنا، شراب نوشی، سرتہ، قذف کی سزاؤں میں کسی کو معافی یا تخفیف کا حق

نہیں۔ اور قصاص در ثار کی مرضی پر ہے نہ کہ حکومت کی۔ نیپ کے امیر زادہ خان نے کہا کہ جب مکمل عدالتی تحقیقات اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مزادی گئی ہے۔ تو ایک حاکم کسی انتظامی حکم کو رعبہ اسے کیسے کا عدم کر سکتا ہے۔ ملک محمد اختر اور ملک محمد جعفر نے کہا ان اختیارات کا مقصد کسی ممکنہ عدالتی غلطی کو درست کرنا ہے۔ مگر راؤ خورشید علی نے کہا کہ کیا اس اختیار کے استعمال میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کم از کم جوڈیشل کنسل سے مشورہ تو ضروری ہونا چاہئے۔ خان عبدالغفور خان نے ترمیمات کی مخالفت میں سرکاری ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ حزب اختلاف شک و شبہ کی بناء پر ترمیمات پیش کر رہی ہے۔ اقلیت کو اکثریت پر رائے ٹھونسنے کا کوئی حق نہیں۔ (اور یہ وہ اختیار تھا کہ جہاں بھی مخالفانہ موقف کا معقول جواب نہ ہوتا۔ خان صاحب اور بعض دیگر سرکاری ارکان کی زنجیل سے نکل آتا) خان صاحب نے اس پر اس نہیں کی۔ بلکہ کہا کہ بعض ارکان نے ہر ہر دفعہ میں قرآن و سنت کی قید لگانا فیشن بنالیا ہے۔ ان کی پارٹی کے رکن عنایت الرحمن عباسی نے پھر بھی انصاف کا مظاہرہ کیا۔ اور کہا کہ سسزاول میں تصرف قرآن و سنت کی روشنی میں ہونا چاہئے۔ مگر آگے ایک عجیب ارشاد ہوا کہ آیا اس وقت عدالتی فیصلے قرآن و سنت کی بنیاد پر ہو رہے ہیں۔ کہ اس جمہوری شق کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ گویا وہ بھول گئے کہ یہ آئین آئندہ کے لئے بنایا جا رہا ہے۔ موجودہ نظام عدالت کو برقرار رکھنے کے لئے نہیں۔

ملک اختر نے سرکاری ترجمانی کرتے ہوئے دنیا کے ایسے دساتیر کی مثالیں اپنی تائید میں پیش کیں۔ جن میں ایسے اختیارات موجود ہیں۔ مگر کاش کہ وہ کتاب و سنت سے بھی کوئی حوالہ پیش کر سکتے۔ قرآن و سنت کے مطابق آئین سازی کے مقابلہ میں دنیا کے دساتیر، دنیا کی رسومات، دنیا کے علماء کے حوالے پیش کرنا تو ایوان میں ایک عام سی بات ہو گئی تھی۔ اس آرٹیکل میں اپوزیشن کی تمام ترمیم مسترد ہو گئیں۔ اور یہ دفعہ ۲۰ دوٹول سے منظور ہو گیا۔

دفعہ ۱۵ | اس میں کہا گیا ہے کہ صدر کو جسمانی، دماغی نا اہلیت یا آئین کی خلاف ورزی یا سنگین غلط روی کے الزام میں برطرف کیا جاسکے گا۔ اگلی آٹھ ذیلی دعوات میں برطرفی کے طریق کار کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اصل دفعہ میں یہ ترمیم لکھی کہ جسمانی یا دماغی یا (اخلاقی نا اہلیت کی بنیاد پر) خلاف میں دسٹے گئے معتقدات اور نظریات بدل دینے پر یا نظریہ پاکستان کی مخالفت میں شہرت پانینے پر یا (بھی برطرف کیا جاسکتا ہے)۔ اگلی ترمیم ۱۵ میں مولانا عبدالحق صاحب نے اس ترمیم کی تشریح فرمائی تھی۔ کہ (اس شق کی اغراض کے لئے اگر کوئی شخص مسلمان نہ ہے

یاد دفعہ ۲۴ میں مذکورہ حلف: میں محولہ کسی بھی عقیدے کی خلافت و رزمی کرے۔ تو وہ اعتقادی نااہلیت کا سزاوار ہوگا۔

مولانا عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ جہاں ہم سہماں، ذہنی اور دیگر باتوں میں عدم اہلیت کی وجہ سے اسے برطرف کر سکتے ہیں۔ تو اعتقادی خرابی کہ بھی اس دائرہ میں محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ ہٹانے کے لئے دیگر بوازدوں کے ساتھ دین سے منحرف ہونے یا حلف کے تقاضوں سے منحرف ہونے پر بھی اسے ہٹایا جاسکے۔ مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے مولانا عبدالحق کی ترسیم کی تائید کی اور کہا کہ اگر اسے دفعہ میں شامل نہ کیا گیا۔ تو اس حلف کا کیا فائدہ رہے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمان کی شرط بھی بخرا جائیگی۔ اگر حلف میں اعتقاد است کا ذکر نہ ہوتا۔ تو اس ترسیم پر زور نہ دیا جاتا۔ اب جب یہ چیز حلف میں شامل کر دی گئی تو برطرفی کے لئے بھی اسے یہاں شامل کرنا ضروری ہے۔ نہ صرف یہ ترسیم بلکہ اس دائرہ میں برطرفی کے بخورہ طریق کار کے بارے میں بھی تمام تر ترمیم سسترو و پیش اور دفعہ منظور ہوتی۔ دفعہ ۱۱ اس دفعہ میں ہے کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں صدر وزیر اعظم کے مشورہ اور اس کے مطابق عمل کرے گا۔ اور وہ ایسے مشورہ کا پابند ہوگا۔ نیز صدر کے احکامات سے تائب باعزابطہ ہونگے کہ اس پر وزیر اعظم کے دستخط ہوں۔

اس دفعہ میں زیادہ تر ترمیمات کا مقصد بھی ایسے اسلامی اور گھری بنانا تھا۔ چونکہ یہ ظہور الہی کی ترمیم تھی کہ صدر قرآن و سنت اور آئین کے دیگر احکامات کے تابع اپنے فرائض کی انجام دہی میں مولانا نودانی صاحب، پروفیسر غفور صاحب وغیرہ کی مشترکہ ترسیم اور انصاری صاحب، جتوئی صاحب، قصوری صاحب کی ترمیمی یہ تھیں کہ جہاں آئین نے صدر کو اپنی عبادت پر عمل کرنے کا اختیار دیا ہو وہاں وہ پابند ہوگا۔ تا پور صاحب، سوری صاحب، میاں محمود علی صاحب، راز نور شید علی صاحب کی ترمیمیں یہ بھی تھیں کہ صدر وزیر اعظم کی بجائے ذاتی حکومت کے مشورے کا پابند ہونا چاہئے۔ مفتی محمد صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کی مشترکہ ترمیم میں اصل دفعہ کی مخالفت نہ پیش تھی۔ البتہ انہوں نے ترمیم کے ذریعہ یہ اضافہ کرنا چاہتا تھا کہ (الایہ کہ صدر آئین کے احکام کی پابندی کے سلسلہ میں وزیر اعظم سے مواخذہ کر سکے گا۔) صدر کے احکام کی باعزابطہ وزیر اعظم کے دستخطوں پر ذوق مند رکھنے کی بھی ترمیم ۱۳۵۵ سے لیکر ۵۲۵ تک مخالفت کی گئی تھی۔ اور سب سے اسی کے منصف یا تبدیلی پر زور دیا گیا تھا۔ ایک ترمیم یہ تھی کہ صدر وزیر اعظم کا مشورہ تائب قبول کرے۔ سب سے قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ مولانا عبدالحق اور مفتی محمد صاحب نے یہ مطالبہ دہرایا کہ صرف ایسے مشورے قبول ہوں جو کتاب

سنت کے مطابق ہوں۔

مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف تو ہم صدر کو اسلامی حدود و سنڈاؤں اور صریح احکام میں درست انداز ہی کا حق صرف اس بنیاد پر دیتے ہیں کہ دیگر اقوام کے ہاں ایسا ہو رہا ہے جبکہ ہمارا ملک اور آئین اسلامی ہے۔ یہاں بالادستی خدا اور رسولی کو ہے۔ مگر ہم صدر کو ان احکامات کے بدلنے کا اختیار دینے سے بھی نہیں شراکتے۔ لیکن یہاں ہم صدر کو اتنا پابند بناتے ہیں کہ وہ محض وزیراعظم کا پی۔ اے۔ بن جائے۔ صدر ڈکٹیٹر نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اگر وہ ہر بات میں وزیراعظم کے رحم و کرم پر رہ جائے۔ تو بالواسطہ صدارت بھی اسی پارٹی کے تمام تر مفادات میں محصور ہو کر رہ جائے گی جس پارٹی کو وزارت عظمیٰ حاصل ہے۔ دونوں ایک پارٹی کے حقوق کے محافظ ہونا چاہئیں گے۔ جبکہ دوسروں کو حق تلفی سے بچانے کے لئے صدر کا غیر جانبدار ہونا ضروری ہے۔ اس لئے پارلیمانی نظام کی بناء پر اگر اختیارات وزیراعظم کے پاس رکھنا بھی ہیں، تو صدر کو یہ حق تو دینا چاہئے کہ آئین کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ وزیراعظم سے محاسبہ کر سکے گا۔ دفعہ کی لفظی اصلاح کرتے ہوئے مولانا عبدالحق نے کہا کہ یہاں مشورہ کا لفظ بھی موزوں نہیں۔ کیوں کہ مشورہ کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔ تو مشورہ اور پھر اس کی پابندی اجتماع متدین ہے۔ اگر دفعہ رکھنا ہی ہے تو صرف اتنا کافی ہے کہ صدر وزیراعظم کے احکام کا تابع ہو گا۔

ظہور الہی صاحب، احمد رضا صاحب نے بھی صدر کو دستخطوں کا پابند بنانے کی مخالفت کی اور کہا اسی طرح تو صدر کو بنجواؤں کی سٹروپا کی طرح ایک چیز بن جائیگا۔ مولانا عبدالحق نے کہا کہ اس طرح صدر کے عہدے کا وقار گرے گا۔ پروفیسر غفور نے کہا کہ منظم اعلیٰ وزیراعظم ہی رہتا ہے۔ مگر اسے کاہنہ کے مشورے پر کام کرنا چاہئے۔ مفتی محمود نے کہا کہ اگر وزیراعظم ملکی سلامتی کے تحفظ میں ناکام ہو جائے تو صدر کو اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ بزنس اور علی احمد تاپور چاہتے تھے کہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ وزیراعظم کو مسلح افواج کی تقریریں، سپریم کورٹ کے جج اور الیکشن کمیشنر مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے اس مرحلہ پر خان عبدالغفور خان نے آئینی سمجھوتہ کا حوالہ دیا۔ بزنس نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ تمام اسٹیٹ پاورز وزیراعظم کو تفویض کی جائیں۔

پیرزادہ صاحب نے اس تمام بحث کے جواب میں کہا کہ یہ رنگ وزیراعظم منتخب نہایت (وزیراعظم) کی بجائے غیر منتخب شخص (صدر) کو اختیار دینا چاہتے ہیں۔ اور اس دفعہ کی مخالفت حسب عملی کی بجائے بعض مساویہ ہے۔ رائے شماری ہوئی اور دفعہ ۵۵ دونوں سے منظور ہو گئی۔

دفعہ ۵۲ | اس دفعہ میں یہ ہے کہ صدر کا عہدہ خالی ہو جانے کی صورت میں سینٹ کا چیئرمین یا قومی اسمبلی کا سپیکر قائم مقام صدر ہوگا۔ جب تک نئے صدر کا انتخاب نہیں ہوتا۔ کلیدی منصب کے لئے ویسے بھی مسلمان ہونا ضروری ہے۔ پھر جبکہ عہدہ ایسا ہو کہ اس پر فائز شخص بطور نیابت صدارت کے عہدہ پر بھی فائز ہو سکے جس کے لئے مسلمان ہونا لازمی شرط مان لی گئی ہے۔ اسلئے یہاں مولانا عبدالحق کی ترمیم ۵۲ء یہ تھی کہ چیئرمین اور سپیکر کے ساتھ لفظ مسلمان درج کیا جائے مگر صدر دستور نے مشورہ دیا کہ اس ترمیم کو سپیکر سے متعلق دفعہ ۵۲ پر ملتی کر دیں دوسرے دن مولانا نے تحریک استحقاق پر کہا کہ اخبارات نے اسی ترمیم کی واپسی کا تاثر دیا ہے۔ جبکہ میں کسی ایسی ترمیم کو برگز واپس نہیں لوں گا۔ جس کا مقصد اسلامی اصولوں پر عمل درآمد کرنا ہو۔ چاہے ایوان اسے رائے شماری میں مسترد کر دے۔

باب دوم

پارلیمنٹ

اس باب کا تعلق قومی اسمبلی، سینٹ کی تعداد ارکان، اہلیت انتخاب، میعاد اسمبلی سپیکر، ڈپٹی سپیکر، اجلاس طلب کرنا، رائے شماری، کورم، قومی اسمبلی کا توڑنا، سینٹ، چیئرمین اور ارکان یا پارلیمنٹ کے بارہ میں تعریحات سے ہے۔

دفعہ ۵۳ | یہ پہلی دفعہ ہے۔ اس میں عبدالحق بلوچ نے کہا کہ لفظ سینٹ کی جگہ قومیتوں کا ایوان ہونا چاہئے۔ تاہم انہوں نے ترمیم واپس لی۔

دفعہ ۵۴ | اس دفعہ کی شق ۱ کے بارہ میں فاروقی صاحب پروفیسر غفور صاحب،

شرکت حیات صاحب، نورانی صاحب، مزاری صاحب، چوہدری ظہور الہی صاحب کی ترمیم میں جو لگانہ انتخابات کی بنیاد پر زور دیا گیا تھا۔ اس دفعہ کے آخر میں عورتوں کے لئے دس مخصوص نشستیں محفوظ کرنے کا ذکر تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی ترمیم ۵۴ء میں عورتوں کی ایوان میں نمائندگی کی مرے سے مخالفت کرتے ہوئے اس دفعہ کی شق ۱ کو حذف کرنے پر زور دیا۔ برطانوی اثرات اور مغربی تہذیب کے تسلط سے یہ بات کتنی ہی عجیب کیوں نہ لگے۔ مگر ایک اسلامی مملکت جس کا سرکار ہما مذہب اسلام ہو۔ آئین کو اسلامی کہا جا رہا ہو۔ اس کے بارہ میں اسلامی

نقطہ نظر کی ترجمانی بہر حال ضروری تھی، اسلام کے نظام خلافت و حکومت میں کہیں بھی عورتوں کا اس کھلے بندوں بے حجابانہ طور پر لقیوں کے ساتھ مجالس مشاورت میں شمولیت کو تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھا گیا، اس لئے اسلامی موقف پیش کرنا ایسے ہر موقع پر ضروری سمجھا گیا اگر ہمیں مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر ایسی باتوں میں احساس کمتری میں مبتلا ہونا تھا تو اسلام کے نام پر ایک علموہ سٹیٹ بنانے کی ضرورت نہ تھی۔

مگر جب ہم اپنے ملک، اپنے آئین، اپنی اسمبلی کو اسلامی کہیں گے تو ایسی تمام باتوں میں مغربی رائے عامہ سے مرعوب نہیں بلکہ جرأت مندانہ طور پر اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ بہر حال اسی دفعہ میں مولانا عبدالحق اور دیگر تمام محرکین کی ترمیم بائیکاٹ کے دوران ساقط ہو گئیں۔ مگر جب مولانا غلام غوث ہزاروی کی ترمیم ۵۳۶ زیر بحث آئی اور جس میں اپنے کہا تھا کہ اگر عام انتخابات میں مرد اور عورتیں برابر کی امیدوار ہو سکتی ہیں، تو پھر مخصوص اور محفوظ نشستوں کی ضرورت نہیں۔ اس ترمیم پر بحث میں مولانا عبدالحق کے موقف کی ترجمانی بھی بعض ارکان کی زبانی ہو گئی۔ مولانا ہزاروی نے اس بحث میں اپنی ظریفانہ طبیعت کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور کہا اب تک عورتیں اپنے استحصال کا داویلا کرتی تھیں مگر اس طرح تو مردوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ اگر انہیں یہ محفوظ نشستیں دی جا رہی ہیں تو پھر عام انتخابات میں مردوں کے ساتھ انہیں ووٹ کر کے ایک ایک مرد ووٹر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔

بیکم نسیم جہاں نے عورتوں کی ترجمانی کی اور کہا کہ قائد اعظم نے پہلی بار ہمیں مخصوص نشستیں دیں ۱۹۴۶ء میں عورتوں نے عام انتخابات میں حصہ لیا۔ اس طرح عام انتخابات کے ساتھ محفوظ نشستوں کا اصول بھی تسلیم کیا جاتا رہا۔ حاکم علی زرداری اور پی پی پی کے دیگر ارکان عباس گریزی، خورشید حسن میر، زکس نعیم نے بھی عورتوں کی دکالت کی اور عورتوں کے ساتھ ظلم کا رونا رویا۔

جناب علی حسن منگی نے کہا کہ ان سیٹوں میں تو مزید اضافہ بھی ہونا چاہیے۔ زرداری نے کہا کہ مجھے ایوان میں خواتین کے خلاف ترمیم سے دکھ ہوتا ہے۔ گریزی صاحب نے عورت پر اسلام کے احسانات کا ذکر کر کے زور دیا کہ اب پارلیمنٹ میں بھی اس کی رعایت ضروری ہے۔ میر صاحب نے اندس ظاہر کیا کہ ہماری سوسائٹی اور چارٹیاں اپنے فرائض نہیں پہچان سکیں ورنہ عورتوں کو عام انتخابات میں بھی منتخب کیا جاتا۔ ہزاروی صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ خوشی ہے کہ پہلی مرتبہ ایک قانون نے تسلیم کیا کہ عورت محکوم ہے، مگر یہ ناکم یہی قرآن کریم کا موقف ہے۔ اور جالہ

قواموں علیہ النساء۔ مرد حاکم بھی ہے، محب بھی ہے، خاتون نکوم ہے مگر محبوب بھی ہے مگر زیادہ
زن مرید شخص مردوں میں شمار نہیں ہوتا۔ انہوں نے مزید کہا ہم عورتوں کو مشورہ میں شریک کرنے کے مخالف
نہیں مگر یہ عجب خاتون خانہ ہو گی نہ ہو۔

اگر انہیں جنرل الیکشن میں حصہ لینے پر اصرار ہے تو مجھے کیا۔ یہ عزت است سرفیض بھی کامیاب
ہو جائیں اور پورا مال "زنانه آسمانی پال" بن جائے تو مجھے کیا اعتراض ہے۔ مگر یہ تو ظلم ہے کہ اور حرام
انتخابات میں بھی اور اور خصوص نشستوں کی شکل میں بھی اسے دوہرا موقع دیا جا رہا ہے۔ اگر عورت
بے حیائی کا پتلا بنتی ہے، کلموں کی رانی بنتی ہے تو اسلام اسے کبھی بھی اسکی اجازت نہیں دیتا اسی
بحث میں حصہ لیتے ہوئے ٹیڈی سپیکر جناب حنیف خان صاحب نے ایک طرح مولانا عبدالحق
صاحب کی ترمیم کی ترجمانی کی اور کہا کہ مجھے آپ رجعت پسند کہیں مگر میں عورتوں کے انتخاب کا
مخالف ہوں۔ اپنے علم پر اسلام کے مطالبہ کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ اس میں عورت کو مجلس شوریٰ
کا ممبر یا سربراہ مملکت ہونے کا اختیار نہیں، یا گیا ہمارے ملک میں تو عورتوں کے انتخابات میں
بحیثیت ووٹر کے حصہ لینے سے بھی دھاندلی ہوتی ہے جس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے انکی رٹے
پر تنقید ہوتی، مگر خان قیوم صاحب جو ان کے پارٹی ٹیڈے تھے پر تو یہ بات بڑی ناگوار گندہی اور انہوں
نے یہ کہتے ہوئے سجدہ ہو ضروری سمجھا کہ معلوم نہیں خان حنیف خان اس حد تک کیوں گئے۔ مگر
میری پارٹی تو عورتوں کو اس طرح کے حقوق دلاسنے میں پیش پیش رہے گی۔

پیرزادہ صاحب، وزیر قانون نے بحث ختم کراتے ہوئے کہا کہ عورتوں کا جنرل الیکشن میں حصہ
لیکر بہت سی سیٹوں پر منتخب ہونا تو ہمارا منشور ہے۔ پی پی پی نے ان حسین خواتین کو سامنے رکھا
ہے کہ مرد عورت کو برابر کر دیا جائے مگر ملکی حالات اور واقعات اس بارے میں نامساعد ہیں یعنی
ساشرہ نے اتنی ترقی ابھی تک نہیں کی، انہوں نے نسیم مہال کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی کہ عورتوں
کو عورتوں ہی عام انتخاب کے ذریعہ منتخب کریں۔ اور کہا کہ اس طرح دو غلطی ہوگی۔ پہلی مولانا ہزاروی
کی ترمیم پر دو ٹوک ہوئی، جب اختلاف یہاں سے معاملہ کر چکی تھی۔ مولانا کو ایک ہی دوش یعنی
عزیز اپنا دوش ملا، ترمیم ستر ہو گئی۔ اھ یہ حزب اقتدار کی بے مردتی اور کم جوشگی کی سبب سے
بڑی علامت تھی کہ انہوں نے مولانا ہزاروی نے پورے حزب اختلاف کی شعلی مول لی تھی اسے آج دوچار
کی حمایت بھی نہ دلائی گئی اور وہ یوں جھٹکے جا رہے ہیں۔

اس دفعہ میں سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے ارکان کی ترمیمیں یہ عین کہ ووٹر کی عمر بچائے

اکیس سال کے اٹھارہ کر دیا جائے جسے مفاہمت کے نتیجہ میں قبول کر لیا گیا۔ اس دفعہ کی شق ۱۷ میں قبائلی علاقوں کی نشستیں پہ کر سنے کا طریق کار صدر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس طرح دہاں کے عوام کی مرضی کے بغیر اور بائیں راستے وہی کے طریق کار کو چھوڑتے ہوئے سلیکشن کے ذریعہ ایسے افراد نامزد کر کے آجاتے ہیں جو عوام کے سامنے تو اسلام کے لئے لڑنے کا حلف اٹھا اٹھا کر اسمبلی میں آ جاتے ہیں، لیکن یہاں آکر وہ حکومت کے لئے تریپ کا پتہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ موجودہ اسمبلی کے اکثر قبائلی ارکان بھی طور پر لاکھ دیندار اور متدین بھی انہوں نے اپنے عوام سے بھی اسلامی و فحاش اور ترمیمات پر علماء کی حمایت کے وعدے کئے تھے۔ اور شاید دل سے چاہتے بھی تھے۔ مگر کسی ایکس ترمیم میں بھی انہیں سرکاری بیچوں کی مخالفت کرنے کی ہر راست نہ ہو سکی، بے چارہ ”نامزدگی“ کی بدولت اتنے مجبور و بے بس تھے کہ اپنے عوام اپنے ضمیر اور ملکی جمہوری، اسلامی تقاضوں کی رعایت کرتی، کسی موثر پر بھی انہیں غصیب نہ ہو سکی۔ یہ اسی طریقہ انتخابات کا نتیجہ تھا جسے سننے آئین میں بھی تحفظ دیا گیا۔

حقی محمد صاحب، مولانا عبدالحی کی مشترکہ ترمیم ۵۵۲ میں کہا گیا تھا کہ اس طریق کار سے متعلق ذیلی دفعہ ۱۷ حذف کر دی جائے۔ مزید کئی ایک ترمیم میں ارکان نے قبائلی علاقوں کیلئے انتخابی طریق کار وضع کرنے کا حق عدہ کی بجائے قومی اسمبلی کو دینے پر زور دیا تھا۔ مخصوص قبائلی نشستوں کے علاوہ خواتین کی ریزرو سیٹوں کی تقسیم سے بھی توازن قائم نہیں رہتا اس لئے مزید اختلاف کی ترمیم میں تھا کہ ہر صوبے کیلئے کم از کم ایک نشست مخصوص کرنا ضروری ہے اور جہاں زیادہ خاتون ارکان کا انتخاب کرنا ہو۔ یہ انتخاب داخل قابل استعصال دوسٹ کے ذریعہ متناسب نمائندگی کے طریق کار کے مطابق ہوگا۔

پی پی پی کے ناصر علی شاہ، افضل رند، عواد صاحب، چوہدری برکت اللہ صاحب نے اسمبلیوں میں اقلیتی فرقوں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کرنے پر زور دیا۔ وہ ارکان جو اسمبلی کے ارکان کیلئے مسلمان اور دیانتدار ہونے کی ترمیم کی زور شور سے مخالفت کر رہے تھے۔ آج ان ترمیم کے حق میں بول رہے تھے۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ جب جنرل الیکشن کا دروازہ بلا امتیاز فریب سب کے لئے یکساں چھوڑ دیا گیا تو اس طرح ریزرویشن کرنا کہ غیر مسلموں کے باحق مسلموں کا دوبرا استعصال نہیں ہوگا وہ تو اچھا تو کہ اقلیتی فرقہ کے راجہ تری دیوار کے صاحب نے خود ان کی مخالفت کی اور یہ ترمیم واپس کر دے گی۔

دفعہ ۵۵ | قومی اسمبلی کی میعاد کے بارے میں ہے کہ اگر وہ اس سے قبل نہ توڑی جا چکی ہو تو اپنے پہلے اجلاس کے لئے مقرر کردہ دن سے پانچ سال تک برقرار رہے گی اور اپنی میعاد کے اختتام پر ٹوٹ جائے گی۔ اس میں راؤ نور شید علی، محمود علی قصوری، عبد الحمید جتوئی، احمد رضا قصوری وغیرہ کی ترمیمیں یہ تھیں کہ الفاظ ”اگر وہ اس سے قبل نہ توڑی جائے“ اس طرح تبدیل کئے جائیں کہ اگر اسمبلی خود اپنی منظور کردہ قرارداد کے ذریعہ اس سے قبل خود کو نہ توڑے۔ حزب اختلاف کے مشترکہ گروپ کی ترمیم میں پانچ سال کی بجائے چار سال درج کرنے کا ذکر تھا۔ اور غفرانصاری صاحب کی ترمیم میں تین سال کا۔

دفعہ ۵۶، ۵۷، ۵۸ | اس کا تعلق قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر سے ہے مولانا عبد الحق مدظلہ کی ترمیم مندرجہ اور مفتی محمود، مولانا عبد الحق، مولانا صدر الشہید کی ترمیم ۵۹ء میں مشترکہ طور پر سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے عہدہ کو مسلمان سے مقید کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ یہاں سپیکر صاحب کے حسب وعدہ مولانا عبد الحق نے اپنی ملتوی شدہ ترمیم پیش کی اور کافی بحث (جو مشمولہ الحق ہے) کے بعد سپیکر نے ترمیم مسترد کر دی۔ مولانا کا اصرار تھا کہ جب وہ صدر کا قائم مقام ہو سکتا ہے، جس کے لئے مسلمان ہونا ضروری شرط ہے تو نائب کو بھی اس شرط کا پابند بنادینا چاہئے۔ ورنہ اسلامی سلطنت کے سب سے بڑے کلیدی منصب کا چند دنوں کے لئے بھی غیر مسلم کے پاس جانا ملی مفاد کے خلاف ہوگا۔ دفعہ ۵۷ پارلیمنٹ کا اجلاس طلب کرنے کے بارے میں ہے کہ قومی اسمبلی کے ایک چوتھائی تعداد کے طلب کرنے پر بھی اجلاس طلب کیا جاسکے گا۔ جناب امیر زادہ خان، عبد الحمید جتوئی، محمود علی قصوری، راؤ نور شید علی کی ترمیم میں ایک چوتھائی کی بجائے دو پر زور دیا گیا تھا، چوہدری غفور الہی کی ترمیم میں کم از کم چالیس کا ذکر تھا۔ اسی طرح دفعہ ۵۷ میں رائے شماری اور کورم کی تعداد پھر کی بجائے لفظ تیس پر زور دیا گیا تھا۔

دفعہ ۶۱ | قومی اسمبلی کو توڑ دینے کا مسئلہ سر امر وزیر اعظم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس بارہ میں کئی اہم ترمیمیں تھیں، غفرانصاری، راؤ نور شید، قصوری صاحب یہ اضافہ کرنا چاہتے تھے کہ اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کو بھی قومی اسمبلی توڑ دینے کا حق دینا چاہئے۔ مولانا مفتی محمود مولانا عبد الحق کی ترمیم مندرجہ میں صدر اور وزیر اعظم کے ایسے اقدام کو اسی طرح مشروط کرنا چاہتے تھے کہ جب قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کی تعداد مساوی ہو اور اسمبلی اپنے مفوضہ امور کی انجام دہی میں مکمل طور پر ناکام ہو جائے۔ نیز جو صاحب کی ترمیم تھی کہ اگر صدر وزیر اعظم کے مشورہ پر اس صورت میں اسمبلی توڑ سکے گا

رکھے گا کہ وہ ملکی معاملات سے واقف ہو، بدکردار نہ ہو، اسلام کے احکام کی خلاف ورزی، میں شہرت نہ رکھتا ہو۔ مولانا عبدالمصطفیٰ الانہری، مولانا محمد علی رضوی مولانا ذاکر صاحب نے ترمیم میں کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو، ایماندار ہو، اسلامی احکام کا صریح مخالف نہ ہو اور مذہب کا مزدوری علم رکھتا ہو۔ نااہلیت کے ضمن میں بھی یہ حضرات یہ اصرار کرنا چاہتے تھے کہ اگر مسلمان ہونے کی صورت میں اسلام کے مقتضیات کی تعمیل سے انکار کر دے یا کتاب و سنت کے مقررہ حدود کھلے بندوں توڑے یا عقائد اسلام کی خلاف ورزی کی وجہ سے مسلمان نہ رہے۔ راؤ نور شید علی صاحب میاں محمود علی صاحب اس میں اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے سزا یافتہ ہونے کا ذکر بھی بڑھانا چاہتے تھے، مگر چیف الیکشن کمشنر کی رائے میں کوئی نااہل قرار پاسے تو رکنیت چل جائے گی۔ نورانی صاحب اور سر شوکت بیات وغیرہ کی مشترکہ ترمیم اور مولانا عبدالحق کی مستقل ترمیم یہ تھی کہ اس صورت میں عدالت عالیہ میں استغاثہ کا حق ملنا چاہئے مولانا انہری مولانا محمد علی صاحب مولانا محمد ذاکر کی ترمیم یہ تھی کہ ایسے کسی فیصلے میں الیکشن کمشنر اسلامی کونسل سے مشورہ لیا کرے۔

عوامی نمائندہ کے فاسق نہ ہونے اور دینی معیار پر پورا اترنے سے متعلق مولانا عبدالحق کی اس ترمیم پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے وزیر اطلاعات مولانا کوثر میاں نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ رکن اسمبلی اس معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں مولانا نے کہا کہ میں علماء کرام کی اس خواہش کی قدر کرتا ہوں جس کا اظہار وہ آئین کے زیادہ سے زیادہ اسلامی بنانے کے لئے کر رہے ہیں دراصل معزنی اور اسلامی طرز سیاست میں پیدا شدہ تضادات کو دور کرنے کی وجہ سے علماء یہ کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اصلاح کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ نیچے سے اوپر تک اصلاح کی جائے جمہوری معاشرہ کی مثال دودھ جیسی ہے اگر دودھ زہر پلا ہو تو کھن ماف نہیں ہو سکتا۔ لیکن افسوس کہ علماء میں سے بعض معاشرے کی اصلاح کا کٹھن کام نہیں کرنا چاہتے اور مختصر راستے اصلاح کے ڈھونڈ کر رہے ہیں۔ یہ حضرات عوامی نمائندہ کے لئے جو شرائط پیش کر رہے ہیں اس معیار پر اسے کون پرکھے گا، انہوں نے کہا میں علماء کا ادب کرتا ہوں۔ مولانا عبدالحق کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مولانا مفتی محمود مولانا ہزاروی سے پرہیز کرتا ہوں کہ کیا یہ حق ان علماء کرام کو دیا جاسکتا جنہوں نے "مسادات محمدی" کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو فاسق و فاجر ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ کیا عبدالمصطفیٰ حبیبی نام رکھنا اسلام میں جائز ہے۔ مولانا نے کہا کہ کیا علماء رکن پارلیمنٹ کی اہلیت کے معیار پر متفق ہو سکیں گے (اے مسلمان کی تعریف کے پہنچنے کی طرح آج ان ترمیم کے حق میں بھی مختلف مکاتب فکر اہلیت کے معیار پر متفق تھے۔ مگر مولانا

آج بھی اپنے اس مخصوص استدلال (علماء کے باہمی اختلاف) سے ترمیم کی مخالفت فرما رہے تھے) صدر دستور نے بھی ترمیم کے بارہ میں محرک مولانا عبدالحق کو یہ کہہ کر دفعات سے روک دیا کہ تنازعہ نوعیت کی ترمیم نہیں پیش کرنی چاہئے۔

دفعہ ۷۷ تا ۹۱ | اس کے بعد ایوان کے ضابطہ کار قانون سازی، بجٹ، مالیاتی طریق کار کے بارہ میں دفعات ہیں اس کے بارہ میں معقول ترمیمات پیش ہوئیں۔ بجٹ کے متعلق اپنی اہم ترمیمات کو سمیٹتے ہوئے حزب اختلاف نے صدر پاکستان کے نام اپنے جوابی خط میں کہا تھا کہ تمام غیر ملکی معاہدے بشمول غیر ملکی قرضوں اور امداد کے معاملات واجب العمل ہونے سے پہلے قومی اسمبلی کے سامنے منظوری کے لئے رکھے جانے چاہئیں ہمارے ہاں بجٹ کا بہت بڑا حصہ قرضوں کے اخراجات (DEBT SERVING) پر صرف ہوتا ہے۔ بھاری غیر منفعت بخش قرضہ جات بغیر کسی جواز کے حاصل کئے گئے ہیں اس کے تمام معاہدوں سے پہلے خاص پارلیمانی اجازت حاصل کی جائے اور ایسے تمام اداروں کو جن پر اکثریتی ملکیت ریاست کی ہر دونوں ایوانوں کی کمیٹی کی نگرانی اور احتساب تلے رکھا جائے اور ایسے اداروں کا بجٹ بھی قومی اسمبلی کے سامنے پیش ہو۔ ایسی ترمیمات پیش کرنے والوں کی رائے میں یہ اس لئے ضروری ہے کہ صدر مجسٹو ایک پارلیمانی قائد کی حیثیت سے پارلیمنٹ کی بالادستی اور کنٹرول کے حق میں جھکنے کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح انتظامیہ کو اور دراصل انتظامیہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے خود زیادہ اختیارات رکھنا چاہتے تھے۔ بعد میں بجٹ سے متعلق حکومت نے ترمیم کر کے یہ طریق کار اختیار کیا تھا جو وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے سلسلہ میں تھا یعنی کہ اکثریت اگر وزیراعظم کے ساتھ ہو تو اس کے خلاف اقلیت کے ووٹ نہیں گنے جائیں گے، مگر حزب اختلاف سے آخری موقع پر سفاهت کے نتیجے میں متحدہ محاذ کی ترمیم منظور کر لی گئی اور اسے یوں تبدیل کر دیا گیا کہ بجٹ کی نام منظوری کے لئے صرف ۱۵ فیصد ووٹ ضروری ہونگے صوبائی حکومتوں کے اختیارات آرڈیننس سے متعلق بھی ایسی ہی ترمیم تھیں۔ اس کے علاوہ عدم اعتماد کی تحریک اور بجٹ کی موجودہ دفعات کی مدت کو بھی پندرہ سال سے گھٹا کر دس سال کر دیا گیا۔

آرڈیننس

دفعہ ۹۲ | اس دفعہ میں وفاقی حکومت کو حالات کے تقاضے کے مطابق آرڈیننس وضع

اور نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ آرڈیننس جس پر تین دن کے اندر صدر کے دستخط ضروری ہوں گے۔ پارلیمنٹ کے کسی ایکٹ کی طرح موثر ہوگا اسے چار ماہ کے اندر قومی اسمبلی میں پیش کرنا ضروری ہوگا۔ آرڈیننس کی شکل میں جو کچھ قوانین نافذ ہوتے رہے ان کے اثرات بدائے تک موجود ہیں۔ آئین میں ایسے فرامین کو تحفظ بھی دیا گیا ہے نہ تو اسمبلی کی شکل میں قوم کا اعتماد دیا گیا نہ اس کے خلاف بھروسہ کے غم و غصہ کو درخور اعتناء سمجھا جاتا رہا۔ ان تلخ تجربات کو آئندہ کیلئے دہرانے پر بھی اراکین حزب اختلاف کو مختلف شکلوں میں اپنی رائے ظاہر کرنا پڑی۔

احمد رضا قصوری، امیر زادہ خان کی ترمیموں میں اسے حذف ہی کر دینے کا کہا گیا تھا۔ پھر صدر کی ترمیم تھی کہ ایسا اختیار بھی پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیار نافذ پابندی ہی کے تابع ہونا چاہیے۔ مولانا ظفر احمد انصاری کی تجویز تھی کہ یہ اختیار صرف حالت جنگ کے دوران ہی استعمال کیا جاسکے۔ مزید یہ کہ اس کے نافذ کے ساتھ ہی فوراً قومی اسمبلی اور سینٹ کا اجلاس اس کی توثیق کیلئے طلب کیا جاسکے۔ جناب غلام فاروق خان عبدالحمید جتوئی میاں محمود علی، راجہ نور شہید علی۔ اختیارات سندھ سنٹ ٹیکس لگانے یا منظور شدہ میزانیہ سے زائد کسی خرچ کا استثنا کرنا چاہتے تھے۔

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی ترمیم یہ تھی کہ آرڈیننس کے اختیارات کو اس بات سے پر مشروط کر دینا چاہیے کہ (بشرطیکہ وہ اس امر میں کتاب و سنت کی پابندی کرے اور قرآن و سنت کے تقیض کوئی آرڈیننس نافذ نہ کرے) انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سب سے دفعہ ۲۲۷ کی بناء پر قرآن و سنت کے منافی قانون سازی نہ کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ تو اب چار ماہ تک غیر اسلامی قانون سازی کا دروازہ کھول رہے ہیں سبب کہ ایسے دروازے اب تک کسی قومی اسمبلی کے ذریعہ بھی بند نہیں کئے جاسکے۔ عائلی قوانین جیسے آرڈیننسوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، انہوں نے ابو بکر صدیق کے پہلے خلیفہ کا حوالہ دیا جس میں اپنے بر حکم کی اطاعت کو انہوں نے قرآن و سنت سے مشروط کر دیا تھا۔

مقصود یہ صاحب نے کہا کہ آرڈیننس کا طریقہ سرمایہ دارانہ استعمار کے باقیات استیات میں سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا اگر پارلیمنٹ صدر کے کسی ایسے فرمان کو مسترد کر دے تب بھی وہ غنوغ نہیں ہو سکتا۔ ایسے کئی نافذ کردہ فرامین کا مقصد دو مہینے میں پورا ہو گیا اسمبلی سندھ سے روک دیا مگر گورنر نے جو ترقی پارلیمنٹ کا نا جائز قرار دیا اسے واپس لے لیا۔

مگر ہنگام کی وجہ سے ہمیں کرنا پڑتا ہے تو مغربی پاکستان جیسے محدود رقبہ کے ارکان کو چھ گھنٹہ کی مدت میں جمع کرایا جاسکتا ہے۔ عنایت الرحمن عباسی اور جہانگیر علی وغیرہ نے دفعات کی تاثیر کی۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے تمام دلائل کے بعد وہی حربہ پٹایا جو کثرت استعمال کی وجہ سے کذب ہو چکا ہے۔ ارشاد ہوا یہ لوگ سرمایہ دارانہ نظام قائم رکھنے کے لئے آرڈیننس کی مخالفت کر رہے ہیں مگر عوام کی خدمت کا کام ہماری سببہ گا۔ اور اس طرح تمام متعلقہ دفعات مسترد کر دی گئیں مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق نے ترمیم ۹۱ء میں یہ شوقِ خدمت کرنے کو کہا تھا کہ صدر ایسے آرڈینسز پر تین دن میں دستخط نہ کر سکا تو آرڈیننس دستخط شدہ منظور ہوگا۔ مگر پیر زادہ صاحب کی اس یقین دہانی پر مفتی صاحب نے یہ ترمیم واپس لے لی کہ یہاں وفاقی حکومت کا لفظ صدر سے بدل دیا جائے گا۔

دفعہ ۹۷ وزیراعظم کے انتخاب سے متعلق اس دفعہ میں مولانا نورانی، شوکت حیات، پروفیسر غفور وغیرہ کی ترمیم یہ تھی کہ یہ انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعہ ہو۔ چوہدری ظہور الہی صاحب کی ترمیم ۹۱ء میں تھا کہ ایسا شخص لازماً اسلام کے پانچوں ارکان کی پابندی کرے گا۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے کہا ۹۱ء کہ ملکی معاملات سیاست سے باخبری کے ساتھ لازمی ہے کہ وہ ہدایت دہی اور اسلام کی خلاف ورزی کا شہرہ بھی نہ رکھے۔ کوئی ترمیم بھی منظور نہ ہو سکی۔

دفعہ ۹۸ تائید گورنر کی تقرری حلف، عہدے کے شرائط وغیرہ سے متعلق ان دفعات میں اسلامی اور جمہوری اہمیت سے متعلق اہم ترمیم یہ تھیں۔ مفتی محمود مولانا عبدالحق کی مشترکہ ترمیم ۱۰۶ء امیرزادہ خان، میاں محمود علی قصوری، راز خورشید علی کی ترمیموں میں اس کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں پر چھوڑ دینے کا ذکر تھا۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۰۶ء یہ تھی کہ اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ چوہدری ظہور الہی نے یہ اضافہ کیا تھا کہ وہ اسلام کے پانچ ارکان کا پابند بھی ہو۔ مولانا انصاری نے کہا تھا کہ وہ اس سے قبل پانچ سال تک کسی بھی سیاسی جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔ ترمیمات میں اس کی برطرفی بھی صدر کی بجائے صوبائی اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑ دی گئی تھی۔ نیز یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر وہ ملک سے باہر ہو تو صدر قائم مقام گورنر کا انتخاب کرنے کی بجائے صوبائی اسمبلی کا سپیکر یا صوبہ کا چیف جسٹس قائم مقام گورنر ہوگا۔ یا صدر صوبائی حکومت کی سفارش پر قائم مقام متعین کرے گا۔

ایک ہزار سے زائد ترامیم کی کچھ جھلک آپ کے سامنے آگئی۔ اور اس پر حکومت کا رد عمل بھی

ترمیم پیش کرنے والے بے بس تھے اور سوچ رہے تھے کہ ایسے حالات میں اگر آئین منظور ہوتا ہے تو اسکی ذمہ داری کس طرح اپنے سر لے سکتے ہیں۔ دستور سازی کے آخری دن مسٹر نور الامین نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ دستور یہ میں حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے نام سے کوئی تقسیم نہیں ہو سکتی سب ارکان صرف اور صرف ارکان دستور یہ ہوتے ہیں مگر یہاں تو اگر سرکاری پارٹی نے ہزار دل و جان سے کسی ترمیم کے حق میں رائے دینی بھی چاہی تو اسی تقسیم کی وجہ سے یہ جرات نہ ہو سکی، بائیکاٹ کا باہر مجبوری سوچا ہی جا رہا تھا کہ ۲۳ مارچ کو لیاقت باغ کے واقعہ ہاتھ کے بعد جلد ہی اسی فیصلہ کی ذمہ داری اگنی اور اس کے بعد آخری دن تک حزب اختلاف کچھ آزاد اور کچھ پی پی پی کے ارکان اجلاس سے کنارہ کش ہو گئے۔ مگر پورے مسودہ دستور پر اہم اسلامی اور جمہوری ترمیمات تو پہلے ہی سے داخل ہو چکی تھیں اور وہ اب سب کے سب ایوان کے سامنے آچکی تھیں سپیکر صاحب ہر ترمیم کے محرک کو اس کے نام اور ترمیم کے نمبر سے پکارتے ترمیم ان کے نہ ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جاتی مگر اسی طرح ہر مقام پر ایک صحیح بات، اصلاحی تجویز، اسلامی اہمیت سے متعلق ضروری شرائط ایوان کے سامنے آہی جاتیں۔ اور آخر تک غیر موجودگی میں بھی فریضہ ادا سے حق ادا ہوتا رہا۔ البتہ بائیکاٹ کی وجہ سے عرکین بحث کی شکل میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع گنوا بیٹھے۔ مگر نتائج تو ان کے ہوتے ہوئے بھی آپ اب تک دیکھ چکے ہیں۔ اور اس سے یہ لازمی نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی آخر تک تمام ترمیم کا یہی حشر ہوتا۔ جن دو ایک اکابر حضرات نے آخر تک ایوان میں حقہ لیکر اسلامی اور جمہوری کوئی ترمیم پیش بھی کی تو اس کا نتیجہ آپ دوٹوں کی اس تعداد سے (جو صرف ان کا اپنا ہی ووٹ ہوتا) معلوم کر سکتے ہیں۔ اب ہم مختصراً دامان سخن سمیٹتے ہوئے اسلامی اہمیت سے متعلق ایسی بقیہ ترمیم کا مختصراً ذکر کریں گے۔

حصہ ششم

حصہ ششم کی ۱۶۰ سے لیکر ۱۷۴ تک دفعات میں مالی امور، جائداد کی سرکاری ملکیت، مرکز اور صوبوں میں آمدنی کی تقسیم کا طریق کار قرضوں اور آڈٹ، جائداد، بیرونی معاہدے، ذمہ داریاں مقدمات سے متعلق امور کا ذکر ہے۔ ۱۳۴۰ء سے ۱۳۴۳ء تک ترمیمات کا تعلق اس حصہ سے تھا۔ اکثر ترمیمات میں قومی اسمبلی کو ایسے امور میں اہم مقام دینے پر زور دیا گیا تھا۔ گویا یہاں سوال صحیح معنوں میں قومی اسمبلی کی بالا دستی پر قرار رکھنے کا تھا جس کے بارہ میں مسودہ میں بہت الجھول

رکھی گئی تھیں۔ معاہدوں کا انعقاد ان پر نظر ثانی امداد کے معاملات وغیرہ امور پر قومی اسمبلی کی منظور ہو جانے پر عمل پیرا ہونے جیسی باتوں کا ملک کے اقتصادی بحران میں بنیادی حصہ ہے۔ اس لئے مالیات سے متعلق وفاقی حکومت کے تمام معاہدے اور فیصلے قومی اسمبلی کی توثیق کے ”تاج“ ہوئے چاہئیں۔ ان ایک سو سے زائد ترامیم میں لمبی بجز دو ایک لفظی ترمیموں کے کسی ترمیم کو شرف پذیرائی نہ بخشی گئی جبکہ ایک تہائی ترامیم سے زیادہ پیش کرنے والے پی پی پی کے ارکان ایوان میں موجود بھی رہے۔ البتہ بجٹ سے متعلق اسمبلی کی دو تہائی اکثریت کی بجائے سادہ اکثریت کی ترمیم منظور کر دینے کا ذکر پہلے آپکا ہے۔

حصہ ہفتم

عدلیہ

حصہ ہفتم چار ابواب اور ۱۷۵ سے ۲۱۲ تک دفعات پر مشتمل ہے جس کا تعلق عدالت عظمیٰ عدالتوں (سپریم کورٹ ہائی کورٹ) ججوں کی تقرری، شرائط اہلیت سبکدوشی اور انصاف سے متعلق دیگر امور سے ہے۔

دفعہ ۱۷۵ کے ذیل میں عدلیہ کو یوم آغاز سے لیکر تین سال کے اندر تدریج انتظامیہ سے علیحدہ کر دینے کا ذکر ہے۔ ترمیمات میں فوری طور پر ایسا کرنے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے اندر عدلیہ کو الگ کر دینے کا کہا گیا تھا۔ ان میں مولانا ہزاروی صاحب راؤ صاحب عبدالحمید جتوئی صاحب منظور حسین دھندرا احمد رضا وغیرہ کی ترامیم شامل تھیں۔ غالباً ہزاروی صاحب کو ترمیم پیش کرنے کا موقع ملا بھی مگر مسترد ہو گیا۔

دیگر اہم ترامیم یہ تھیں کہ صدر چیف جسٹس اپنی صوابدید اور رائے میں چیف جسٹس کی تقرری کے لئے اسے وزیر اعظم کے مشورے کا تابع بنا دینا قومی مفاد کے منافی ہوگا۔ وزیر اعظم ایک سیاسی شخصیت ہوگی صدر اس محاذ آرائی میں ملوث نہ ہوگا۔ تودہ اپنی اصابت رائے سے مناسب انتخاب کرنے کی بہتر صلاحیت رکھ سکے گا۔ اس لئے صدر وزیر اعظم سے اس معاملہ میں مشورہ لینے کے باوجود فیصلہ کرنے میں آزاد ہونا چاہئے، حزب اختلاف نے تمام عدالتوں پر سپریم کورٹ کے انتظامی کنٹرول کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ یہ عوامی خود مختاری میں مداخلت نہ تھی بلکہ عدالتوں کو انتظامی کنٹرول سے نکالنا تھا۔ بہر حال اسلام کے نظام عدلی و انصاف کا تقاضا تھا۔ پہلے سٹوڈنٹ میں پارلیمنٹ میں جج کی برطانی کی

قرار داد پاس کر کے عدلیہ کی آزادی کو مجروح کر دینے والی تجویز بھی تھی، مگر اچھا ہوا کہ بحث کے دوران وہ تجویز ختم کر دی گئی۔ اور متحدہ محاذ کی یہ ترمیم عین موقع پر قبول کر کے یہ کہا گیا کہ ججوں کی برطرفی سپریم جوڈیشل کونسل کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو عدلیہ اکثریتی پارٹی کے رحم و کرم پر رہ جاتی۔

اس باب میں چند دیگر اہم ترامیم بھی مفہامت کے نتیجہ میں مان لی گئیں، ایک یہ کہ خصوصی عدالتوں اور ٹریبیونل کے فیصلوں کے خلاف قانونی نکات پر سپریم کورٹ میں اپیل کی جاسکتی ہے۔ دوسری یہ ترمیم کہ مالی بحران کی صورت میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں کم نہیں کی جائیں گی تیسری یہ کہ سب سے زیادہ سینئر جج خود بخود ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس بن جائے گا۔

مسودہ کی دفعہ ۱۱۱ میں یہ اختیار صدر کو دیا گیا تھا کہ وہ کسی کو قائم مقام مقرر کر دے۔ اس طرح بھی عدلیہ کی آزادی متاثر ہو سکتی تھی۔ دیگر اسلامی نوعیت کی چند ترامیم یہ تھیں جو منظور نہ ہو سکیں۔

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۴۵ یہ تھی کہ چیف جسٹس لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ ترمیم ۱۴۶ بھی ضمنی طور پر اسی غرض سے متعلق تھی۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحق نے سپریم کورٹ کے ججوں کی شرائط و اہلیت میں ترمیم ۱۴۷ میں یہ اضافہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا کہ ایسا کوئی شخص اس وقت تک عدالت عظمیٰ کا جج نہیں مقرر کیا جائے گا جب تک وہ دیگر شرائط مندرجہ کے علاوہ (اسلامی قانون اور اس کے بنیادی ماخذ قرآن و سنت فقہ سے پوری طرح واقف نہ ہو) ازحری صاحب مولانا محمد علی نے کہا تھا کہ وہ اسلامی عقائد کا بھی کھلم کھلا منکر نہ ہو۔ اور خود کو عدل پر اثر انداز ہونے والی کسی سرگرمی میں بھی ملوث نہ کرے۔ (۱۴۷) مزاری صاحب، نورانی صاحب، پروفیسر غفور صاحب، شوکت حیات صاحب نے بھی مسلمان شرط ہونے کی ترمیم داخل کی تھی۔ ترمیم ۱۴۸ عدالت عظمیٰ کے ابتدائی اختیار سماعت میں کسی قانون کے اسلام سے مطابقت نہ رکھنے کی شکایت بھی شامل کرانے کی تھی۔ اور یہ کہ مذکورہ عدالت اسلامی احکام سے مطابقت نہ رکھنے کی حد تک اسے کا عدم قرار دے سکے اسی طرح کسی سرکاری فیصلہ سے معاشی نظام کے تہ و بالا ہونے کی صورت میں بھی رائے کا حق دینے اور اس فیصلہ کو حکومت کو ہدایت دیکر ختم کر دینے کے اختیارات پر بھی خصوصی زور دیا گیا۔

برزخو صاحب کی ترمیم ۱۴۹ یہ تھی کہ صدر کسی عدالت کے چیف جسٹس کا تقرر صوبائی گورنر کے مشورے سے اور برزیدی صاحب، نورانی صاحب وغیرہ کی رائے میں پاکستان کے چیف جسٹس

کے مشورے سے کرے۔ راؤ نور شید، صدر صاحب، جتوئی صاحب وغیرہ اس میں عدالت عظمیٰ کے ججوں کے بھی مشورے کا اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

دفعہ ۱۹۳ کا تعلق عام عدالت عالیہ کے ججوں کی تقرری سے ہے مولانا عبدالحق نے یہاں ۱۵۱۹ء کی شکل میں وہی ترامیم داخل کر آئیں جو مسلمان مردہوں نے اور اسلامی قانون کے ماتخذ اور اس کے سے باخبر ہونے کے بارے میں تھیں۔

باب ہشتم الیکشن

ارکان اسمبلی نے الیکشن سے متعلق باب ہشتم میں ۱۵۹۷ء تا ۱۶۰۷ء ترامیم داخل کرائی تھیں۔ جمہوریت کی بقاء، اسلام کے فروغ اور انتخابی اداروں کی نشوونما کے لئے لازمی ہے کہ انتخابات دیانتدارانہ اور آزادانہ ہوں اس مقصد کیلئے اہم ترامیم کا خلاصہ جسے متحدہ محاذ نے اپنے مطالبات میں بھی سمولیا تھا یہ ہے :

۱۔ صدر چیف الیکشن کمشنر کا تقرر اپنی صوابدید پر نہ کہ کسی سیاسی وزیراعظم کے مشورہ کے تابع ہو کر کرے۔

۲۔ انتخابات عدالتی حکام کی نگرانی میں منعقد کرائے جائیں ترکی وغیرہ کے آئینوں میں بہت سے ناخوشگوار تجربات کے بعد یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ انتظامیہ کے افسران کو افسر بنانے سے انتخابات کی آزادی متاثر ہوتی ہے۔

۳۔ انتخابات افراد کی بجائے پارٹی سسٹم کی بنیاد پر ہوں (مفتی محمود صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کی ترمیم ۱۹۶۴ء یہی تھی) اس سسٹم کی وکالت برسر اقتدار پارٹی نے اپنے منشور میں بھی کی تھی۔ اسی طرح جب انتخابی نتائج پر روپے پیسے کی افراط بھی ختم ہو سکتی ہے۔ سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنیادوں پر کھینچنے چو۔ شد کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ اور اس طرح کی جمہوریت صحیح معنوں میں جمہوریت کہلا سکتی ہے کہ ۳۰ فیصد ووٹوں سے کامیاب شخص کو ستر فیصد متفرق ناکام افراد کے مقابلہ میں نمائندگی مل جاتی ہے۔ ۷۰ فیصد شہری اپنی نمائندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مگر پارٹی سسٹم سے ہر فیصد افراد کو نمائندگی مل سکے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ پارٹی کے نامزد کردہ صرف اہل اور ممتاز افراد ہی منتخب

ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ ایک فردی اور فضلی جماعتیں بھی خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔

۴۔ انتخابات کے دوران ایک نگران حکومت ضروری ہے، صدر چاہے تو چیف جسٹس وغیرہ کے مشورے سے انتخابی عرصہ کے لئے ایک نگران حکومت قائم کرے۔

۵۔ رائے دہندہ کی عمر ۲۱ سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی جائے۔

۶۔ چیف الیکشن کمشنر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی جائے۔

۷۔ خفیہ رائے دہی سے وزیر اعظم اور کسی وزیر اعلیٰ کا انتخاب مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ مفتی محمود صاحب

مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۹۶۲ء مولانا ظفر احمد انصاری ۱۹۶۳ء ملک محمد اختر ۱۹۶۲ء مزاری صاحب، نورانی صاحب، غفور احمد صاحب، شوکت بیات صاحب ۱۹۶۵ء میں کہا گیا تھا کہ یہ استثنیٰ بھی ختم کر دی جائے۔

۸۔ دفعہ ۲۲۲ میں انتخاب اور ضمنی انتخاب کا وقت ساٹھ دن کی بجائے تیس اور نوے

کی بجائے ساٹھ کر دیا جائے مگر یہ اور اس طرح کی تمام ترامیم مسترد کر دی گئیں، سوائے دو باتوں کے

یعنی رائے دہندہ کی عمر اٹھارہ سال کر دی گئی انتخابات عدلیہ کے ماتحت تو نہیں ہوں گے البتہ انتخابی افسر عدلیہ سے لئے جائیں گے۔

باب نہم

اسلامی احکام

اس حصہ کی حیثیت ہمارے نزدیک گویا آئین کی روح جیسی ہے کیونکہ اس میں ۲۲۷ سے ۲۳۱ تک اسلامی دفعات شامل ہیں۔ اور ابتداء سے علماء ارکان کی یہ سعی رہی کہ یہ حصہ زیادہ سے زیادہ موثر اور قوانین کو اسلامی بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ ضمانت بہیا کرنے کے قابل ہو جائے۔

دفعہ ۲۲۷ کی شق ۱ میں ہے کہ مروجہ جملہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ نیز قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام سے معافی کوئی قانون وضع نہیں کیا جاسکے گا۔ شق ۲ میں ہے کہ اس دفعہ کی تنفیذ صرف آئین کے اس حصہ میں منضبط طریق کار کے مطابق ہوگی (یعنی اسے بنیادی حقوق اور دوسرے قوانین کی طرح عدالتی چارہ جوتی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

شق ۳ میں ہے کہ اس دفعہ کا اثر کسی غیر مسلم شہری کے شخصی قوانین یا شہری حیثیت پر نہیں پڑے گا۔

اگلی دفعہ ۲۲۸ میں اس طریق کار یعنی اسلامی مشاورتی کونسل کی تشکیل وغیرہ کا ذکر ہے۔ (۱) جو یوم نفاذ کے نوے دن کے اندر بنائی جائے گی۔ (۲) اس میں آٹھ سے ایک پندرہ تک ارکان ہونگے جو صدر ایسے اشخاص ہی سے متعین کرے گا۔ جو قرآن و سنت کے متعینہ اسلامی اصولوں اور فلسفہ کا علم رکھتے ہوں یا پاکستان کے اقتصادی، سیاسی قانونی انتظامی مسائل کا فہم ادراک رکھتے ہوں۔ صدر ان باتوں کا بھی تقرری میں خیال رکھے گا کہ اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہو۔ کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ سے متعلق ہوں یا رہے ہوں۔ (۳) کم از کم چار ارکان ایسے (علماء) ہوں جو کم از کم پندرہ سال تک اسلامی تحقیق یا تدریس کے کام سے وابستہ چلے آ رہے ہوں۔ کسی رکن کی مدت تقرری تین سال ہوگی دو سب ارکان میں سے ایک اس کا چیرمین ہوگا۔

دفعہ ۲۲۹ اسلامی کونسل سے مشورہ طلبی کے بارہ میں ہے کہ ایوان یا صدر یا کوئی گورنر صوبائی اسمبلی کی اکثریت کے متنازعہ مسئلہ کو غور و خوض کیلئے کونسل کے سپرو کر سکتے ہیں۔ دفعہ ۲۳۰ میں اس کونسل کے فرائض ہیں کہ کونسل مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے میں پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو سفارشات پیش کرے گی۔ زیر بحث مسئلہ پر رائے دے گی۔ اور یہ کہ کوئی مجوزہ قانون قرآن و سنت کے منافی تو نہیں نیز مرد و عورتوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے تجاویز مرتب کرے گی۔ نیز اسلامی احکام کی ایک موزوں شکل میں شیرازہ بندی کرے گی۔ جنہیں اسمبلیاں قانونی طور پر نافذ کر سکیں۔

درپیش مسئلہ کا جواب دینے کے لئے مدت متعین کرنا پندرہ دن کے اندر ضروری ہوگا۔ (یعنی پندرہ دن میں جواب نہیں مشورہ دینے کی متعینہ مدت کی اطلاع دے گی جو متعین نہیں کی گئی) اس دفعہ کی شق ۳ میں ہے کہ اگر عوامی مفاد میں ضروری ہو کہ کونسل کے فیصلہ کا انتظار نہ کیا جائے۔ تو اسمبلی قانون سازی ملتوی نہیں کرے گی۔

کونسل تقرری کے سات سال کے اندر تہمتی رپورٹ پیش کرے گی۔ نیز سالانہ عبوری رپورٹ بھی، ایسی رپورٹیں صوبائی کے چھ ماہ کے اندر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اندر یا کسی صوبائی اسمبلی کے سامنے لائے جائیں۔ برائے بحدت پیش کی جائے گی (اور اس رپورٹ پر غور و خوض کے بعد اس کے بارہ میں) (نہ کہ اسکی متابعت میں) اس قانون وضع کرے گی۔

یہ اس باب کا خلاصہ ہے جس میں کچھ باتیں قابلِ تحسین تھیں (الف) پہلی دفعہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی (نہ صرف منفی بلکہ) کا ذکر پالیسی کے اصولوں کی بجائے آئین کی ضمن میں آگیا ہے۔ جو قانونی لحاظ سے زیادہ وزن رکھتا، اگر آگے اسے غیر موثر نہ بنا دیا گیا ہوتا۔ اسلامی کونسل کی تشکیل میں علماء کی تقرری و تدریس کے سلسلہ میں بہتر صلاحیت اور استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(ج) پچھلے دساتیر میں اسلامی کونسل کی رپورٹوں کی جگہ عموماً سر دھانے ہی ہوتے۔ مگر یہاں رپورٹوں پر عملدرآمد کا ذکر موثر طور پر کر دیا گیا ہے۔ مگر چند باتیں ایسی تھیں جن سے اسلامی احکام اور قانون سازی سے متعلق یہ حصہ بالکل غیر موثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ نئی اور پرانی قانون سازی کو اسلام کے مطابق کر دینے والی دفعہ کے نفاذ کے لئے دیگر بنیادی حقوق اور دفعات سے الگ طریق کار (اسلامی کونسل) تجویز کر لیا گیا کہ کسی عدالت میں اسے نہیں سے جایا جاسکے گا۔

۲۔ اگر کونسل کی رائے میں کوئی جوڑہ قانون غیر اسلامی ہے تو اسمبلیاں اس کی متابعت میں فیصلہ کرنے یا اپنا کوئی فیصلہ بدل دینے کی پابند نہیں بنائی گئیں۔

۳۔ کسی متنازعہ قانون کو کونسل کے جواب رائے پر موقوف نہیں کیا گیا بلکہ اگر اسمبلی چاہے تو اس سے پیشتر بھی قانون وضع کر سکتی ہے۔ اور ایسے کسی وضع قانون پر دوبارہ غور کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔

۴۔ کونسل کے مشورہ لینے کو بھی صدر یا گورنر یا اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑ دیا گیا۔ گویا اگر سرکاری پارٹی نہ ہوتی تو ایسے کسی استصواب کا موقع ہی نہیں مل سکتے گا۔

۵۔ جوڑہ کونسل میں قرآن و سنت کا علم رکھنے والے ارکان کی تعداد ۱۵ میں سے صرف چار ہے جو ایک اقلیت ہونے کی وجہ سے اپنا صحیح فیصلہ کونسل سے نہیں منوا سکتے۔

۶۔ اسلامی کونسل کو اپنا جواب بھیجنے کے لئے محدود مدت کا پابند نہیں بنایا گیا۔

چنانچہ ارکان کی طرف سے اس حصہ کو اسلامی قانون سازی کی ضمانت کا قابل بنانے کیلئے کئی اہم ترمیم آئیں اور دستور کی پہلی خواندگی کے دوران بھی علماء نے ان غائبوں کی طرف تفصیل سے روشنی ڈالی اس ضمن میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق کی منفصل تقریر پچھلے شمارہ میں شائع بھی ہو گئی ہے۔

۱۔ دکھانہ | اہم ترین خرابی یہ تھی کہ اس حصہ کو دیگر قوانین کی طرح کسی عدالت عالیہ میں سے جانے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا اس کے بارے میں مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۹۵۳ء اس طرح پیش کی۔

دفعہ ۲۲۵ کی شق ۲ کہ اس طرح بدل دیا جائے کہ (کسی قانون کے بارہ میں سبب یہ اعتراض اٹھایا جائے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے تو اس کی سماعت کا اختیار سپریم کورٹ کے ایک خصوصی بنچ کو ہوگا جسے صدر اس مقصد کے تحت نامزد کرے گا۔ جو پانچ ارکان پر مشتمل ہوگا۔ اور ان کے لئے وہی شرائط ہوں گی جو دفعہ ۲۲۵ کے ذیل ۳ میں اسلامی کونسل کے ارکان کے لئے مقرر کی گئی ہیں)۔ ترمیم ۱۶۵۱ بھی اسی کے مترادف تھی جو مولانا عبدالحق اور مفتی محمود کی مشترکہ ترمیم تھی۔ محمود عظیم نادر و قی اور صاحبزادہ صفی اللہ نے بھی عدالت عظمیٰ کا مطالبہ ۱۶۵۲ میں دہرایا تھا۔

نیز دفعہ ۲۲۵ کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۶۵۱ میں بھی اضافہ کرانا چاہا کہ (کوئی کوئی ایسا قانون، علامہ حکم یا آرڈیننس جو اسلامی احکامات کے متناقض ہو ایسے تناقض کی حد تک کالعدم ہوگا۔)

پارلیمنٹ کی بالادستی یا اسلام کی ؟

اس اہم ترمیم کے بغیر اسلامی قانون سازی کی ضمانت نامہ مشکل تھی اس کے جواب میں سرکاری پارٹی، وزیر قانون، یہاں تک کہ صدر محترم تک یہ کہہ کر جان خلاصی کرتے رہے کہ اس طرح تو اسلامی کونسل یا عدالت عالیہ کو پارلیمنٹ پر بالادستی حاصل ہو جائے گی۔ جو جمہوریت کے منافی بات ہے۔ ایوان کے اہل علم حضرات، حزب اختلاف کے زعماء نے پہلی خواندگی کے دوران اس کا مدلل جواب دیا اور کہا گیا کہ جب پارلیمنٹ کو بنیادی حقوق اور دیگر بہت سے جمہوری تقاضوں پر مبنی ضمانت میں بالادستی نہیں دی جا رہی اور عدالت عالیہ ان ضمانت کے منافی کسی قانون کو کالعدم کر سکتی ہے۔ تو آخر کسی قانون کی اسلامی حیثیت متعین کرانے سے جو ایک مسلمان کیلئے تمام حقوق سے بڑھ کر بنیادی حق ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی کیوں مجروح ہو جاتی ہے۔ ؟

اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اسلام کو قوت کا کہہ کے طور پر تسلیم کر لینے کا یہ منطقی تقاضا ہے تو بالادستی کے استدلال سے اسلامی قانون سازی پر پھرتی پھیرنا کیوں ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر صدر جھٹو اور اکثریتی پارٹی کو یقیناً معلوم ہے کہ کسی وفاقی آئین میں ہر قانون ساز ادارہ کسی چوکھٹے ”بیگن فریم ورک“ کے اندر رہ کر کام کرتا ہے۔ جو خود اسمبلیاں بھی ایک چوکھٹے کو سامنے رکھ کر منتخب ہوتی ہیں آئین بذات خود کسی قانون ساز ادارے کے اختیارات کی حدود کا تعین کرتا ہے۔ کہ ان حدود کے اندر اسے قانون بنانے کے اختیارات حاصل ہوں گے۔

بنیادی اصول اور جائز و ناجائز کی تیز سمجھ بغیر حاکمیت مطلقہ کی تو لادینی جمہوریت میں بھی گنجائش نہیں، نہ کسی ایوان کو ایسی کھلی چھوٹ دی گئی ہے بلکہ کسی سٹیٹ کے اساسی نظریات کی حدود میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ تو جہاں اسلام سٹیٹ کا سرکاری مذہب ہو اور قرآن و سنت پر مبنی یقین کو لازمی سمجھا گیا ہو۔ تو کسی قدغن لگائے بغیر بے لگام جمہوریت کو اسلامی احکام و حدود کو روندنے کی کسب اجازت دی جاسکتی ہے۔ جمہوریت کو سیاست کہنے کے ساتھ ساتھ اسلام کو اپنا دین سمجھنے کا عقیدہ پھر کیا رہ جاتا ہے۔ اور پھر اسلام کسی سٹیٹ کا سرکاری مذہب آخر میں کیسے سکتا ہے دراصل مغرب کی لادینی جمہوریت کو اسلام کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ قانون اور آئین بنانے کا حق صرف مخلوق کے خالق کو ہے۔ فیصلہ کا مدار اہلیت و صلاحیت ہے۔ اکثریت یا اقلیت پر نہیں ہم ”جمہوریت“ سے وابستگی جتنی بھی لازمی کیوں نہ سمجھیں اسے اسلام کے تصور حکومت اور نظام خلافت کے تالچ کوٹنا لازمی ہوگا جس طرح سوشلزم ایک کافرانہ مادی نظام ہے مگر جو لوگ اس کا نعرہ لگانا چاہتے ہیں۔ وہ بھی مجبوراً اسے مساوات محمدی کا عکاس بنانا اور اس کا اسلامیات ضروری سمجھتے ہیں لیکن جمہوریت ماور پند آزاد شکل میں تمام اسلامی قیودات اور حدود سے کھلا رکھ کر نظام سیاست اور نظام قانون سازی بنانا کتنا خطرناک عمل ہے اس کا اندازہ جمہوریت کی مالا جھینے والوں کو وجود و مستند سازی سے ہوجا ہوگا کہ اسلام اس جمہوریت کے باغیوں کتنا بے بس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسلامی تعلیمات اس بارہ میں صاف اور بالکل واضح ہیں کہ کسی قانونی اور ملکی مسئلہ یا کسی بھی معاملہ میں باہمی نزاع اور اختلاف کی شکل میں اس کا آخری فیصلہ کرانا اور اسکی دینی اور اسلامی حیثیت یقین کرنا خدا اور رسول کا کام ہے۔ فالت تنار مستم۔ حق شیعہ حشرورہ۔ اے اللہ والے رسول۔ ایسے متنازعہ امور میں جس کا فریق اول الامر انتظامیہ اور حکومت ہی کیوں نہ ہو فیصلہ خدا اور رسول سے کرایا جائے گا۔

مگر کیا ہم ایسے امور خود خدا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ رسول کی وفات کے بعد ہم ان کی ذات سے فیصلہ کر سکتے ہیں ظاہر ہے قرآن کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا۔ تو واضح ہے کہ ایک تیسرا ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو کتاب و سنت اور تعلیمات خدا و رسول سے آگاہی رکھتے ہوئے اپنی قوت فیصلہ کے ذریعہ اس تنازع کو ختم کر سکے اس ادارہ کے ارکان متبحر عالم راسخ العقیدہ مومن خدا ترس اور دیانتدار ہوں گے۔ ان کی بالادستی کتاب و سنت کی بالادستی ہوگی۔ نہ کہ ایوان کی۔ حاکمیت کی نفی نہیں ہوئی کہ ایسی کوئی حاکمیت کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ اور جس کا اعتراف قرار داد مقاعد کے ایک ترمیم کی شکل میں مزید زور شور سے کیا گیا۔ یہاں معیار بھی صلاحیت اور اہلیت

ہے، اسے پیشوائیت اور پاپائیت سمجھنا حقائق کو مسخ کرنا ہے۔ اس اہلیت کا راستہ اسلام نے ہرزد کے لئے کھلا رکھا ہے یہ کبھی قوم، نسل، گروہ یا طبقہ کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ علم، فن اور اہلیت کی اجارہ داری ہوگی جسے زندگی کے تمام دیگر فنی اور علمی شعبوں میں ہم مزدوری سمجھتے ہیں۔ آپ انجیروں، کارگیروں، ڈاکٹروں، وکیلوں، سائنسدانوں کا اس طرح کوئی ترجیحی استحقاق اگر اجارہ داری نہیں سمجھتے مگر ایک اسلام ایسا ہے کہ جس کے بارے میں آپ کسی بھی اہلیت اور استعداد کے روادار نہ ہوں تو اس سے بڑھ کر اسلام پر اور کوئی ظلم کیا ہو سکتا ہے؟

بہر حال اسلام میں سواکیت صرف خدا و رسول اور اس کی تعلیمات کو ہے نہ کہ کسی عوامی ہٹ بونگ اور اکثریت کو ارشاد ربانی ہے، لا یستوی الخبیث والطیب ولعلیٰ یجتنبون کثرۃ الخبیث - دوسری جگہ مزید وضاحت سے کہا اور "اکثریت" کی قلعی کھول دی۔ وان احکم بما انزل اللہ ولا تتبع اعداءہ (تا) ان کثیرا من الناس لفساقون - بہر حال دفعہ ۲۲ کو مؤثر بنانے کیلئے ہمیں ایک تیسرے ادارہ کو فیصلہ کرانے حق دینا ہوگا۔ اگر وہ اسلامی کونسل ہے تو اس کے اختیارات، بالادستی، اور شرائط اہلیت کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں تو پیریم کورٹ کے ایسے ججوں کو یہ حق دینا ہوگا جو کتاب و سنت پر مبنی کسی قانونی حیثیت کا فیصلہ کرانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ مگر بحث اور استدلال کے جتنے بھی پہلو سامنے آئے، کسی کو درخور اعتقاد نہ سمجھا گیا نہ آخری وقت میں بھی یہ اہم ترین ترمیم منظور ہو سکی۔ اور یہ اس پارلیمنٹ کی "جمہوری بالادستی" کے نام پر ہوا جسے جمہورالیات بجٹ ایکشن اور دیگر بیسٹار عام دنیاوی امور میں بھی ٹولی ٹکڑی ترمیم بنائی جاتی رہی۔ لیکن یہ وہ بنیادی خرابی ہے جسکی اصلاح کئے بغیر آئین کبھی بھی اسلامی قانون سازی کی مؤثر ضمانت نہیں دے سکتا۔

۲۔ کی اصلاح ۲ دوسری عوامی (پارلیمنٹ کو کونسل کے مشورہ کا پابند نہ بنانے) کا ازالہ مولانا غلام غوث ہزاروی نے ترمیم ۱۹۹۶ میں اس طرح کہا تھا کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی کونسل کی سفارش کو قانونی شکل دے گی مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۹۹۶ میں کہا تھا (کہ پارلیمنٹ اور اسمبلی رپورٹ آنے پر اسکی متابعت میں قوانین وضع کرے) مولانا ذاکر مولانا محمد علی مولانا ازہری نے کہا تھا کہ (جو یہی مشورہ موصول ہو قانون میں حسب مناسب ترمیم کی جائے) یہی ترمیم مولانا انصاری کی بھی تھی۔ مولانا مفتی محمود اور مولانا عبدالحق کی ترمیم ۱۹۹۶ میں بھی اس کے تالیف ہو کر قانون سازی پر زور دیا گیا تھا۔ یہ اہم ترمیم بھی آئین میں جگہ نہ پاسکی۔

۳۔ کی اصلاح کسی قلمدانہ قانون کو قبل از مشورہ وضع کر سنے کی بھی علماء اور ارکان نے مخالفت

کرتے ہوئے ترمیموں میں اصلاح کی کوشش کی مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۹۹۰ میں کہا کہ اگر اسمبلی کسی ایسے قانون کو وضع کرنے کی التواء مصلحت کے خلاف سمجھے تو کونسل استعجاب کے بغیر وضع کرنے کی بجائے ایک محدود وقت کا کونسل کو پابند بنا کر جلد ہی مشورہ حاصل کرنے کے بعد اسکی متابعت میں مجوزہ قانون وضع کرے مولانا مفتی محمود اور مولانا عبدالحق مدظلہ کی مشترکہ ترمیم ۱۹۹۱ میں بھی یہی کہا گیا تھا۔ احمد رضا مقصودی نے اس متن کو حذف کرنے کا کہا تھا۔ پروفیسر غفور، شوکت حیات مولانا نورانی، شیر باز مزاری، مولانا ذاکر وغیرہ نے بھی ہنگامی ضرورت پر مبنی اس گنجائش کی مخالفت کی تھی۔

۲۔ اصلاح کونسل سے مشورہ لینے کو اسمبلی کی اکثریت پر چھوڑنا اس کی افادیت کو ختم ہی کر دینا تھا۔ اس طرح سرکاری پارٹی اگر نہ چاہتی تو مشورہ طلب کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کی بھی شد و مد سے مخالفت ہوتی رہی۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے ترمیم ۱۹۹۰ میں دفعہ ۲۲۹ میں اس طرح اصلاح کرانی چاہی کہ پارلیمنٹ (کہ کم از کم پانچ ارکان کی قرارداد پر کونسل کو سوال بھیجا جاسکے گا۔ اور جواب آنے پر اسکی پابندی کرتے ہوئے قانون سازی کی جائے۔) مولانا ازہری مع رفقاء نے بھی پانچ ارکان مولانا انصاری نے کورم کے برابر تعداد اور مولانا غلام غوث ہزاروی نے اختلاف رائے کی صورت میں لازمی طور پر بھیج دینے کا ذکر کیا تھا۔ ان ترمیمات کو پورا تو نہیں مگر حزب اختلاف سے مفاہمت کے نتیجے میں اس حد تک قبول کر لیا گیا کہ اسمبلی کے ۵۰ فیصد ارکان کی قرارداد پر بھی کونسل کو معاملہ جاسکے گا۔ اس پر حزب اختلاف کو خوشی ہے کہ اس پر سرکاری ارکان بھی کونسل کو سوال کے بھیجنے کے مجاز ہوں گے مگر اسمبلی کے موجودہ ارکان کا ۵۰ فیصد جب کہ ۵۸ ارکان جنتے ہیں۔ تو شاید حزب اختلاف اس ترمیم سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے تاہم ایک حد تک یہ ترمیم بھی غنیمت ہے۔

۳۔ اصلاح اسلامی احکام سے متعلق اس حصہ میں کونسل میں علماء ارکان کی انکلیت یعنی صرف چار علماء کا ضروری ہونا بہت بڑی خامی ہے۔ جبکہ ۱۵ ارکان میں باقی ارکان کے نئے علمی و دینی اہلیت نہیں بلکہ سیاسی اقتصادی قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم و ادراک کافی سمجھا گیا ہے۔ اولاً تو اسلامی احکام سے متعلق کونسل میں یہ تغزب ضروری نہ تھی بلکہ دین و دنیا سے موصوف جامع علماء پر اکتفا کرنا تھا اور ایسا ناگزیر تھا۔ تو متبحر علماء کو مجاہدٹی میں رکھنا لازمی تھا۔ مگر انہوں میں ایسا نہ ہوا۔ اگر چار علماء کے ساتھ اکثریت فضل الرحمن جیسے متجددین کو نہ تھی کر دیا گیا تو کونسل کا فیصلہ جو اکثریت پر مبنی ہوگا کب کتاب سنت کے مطابق قانون سازی میں مدد دے سکے گا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے نہ صرف اس خرابی کے ازالہ پر زور دیا تھا بلکہ علماء ارکان کے جہل و غرور پر اس وقت کے مقتدیہ اسلامی اصولوں اور

فلسفہ کا علم اور کم از کم پندرہ سالہ اسلامی تحقیق و تدریس کی شرط اہلیت کو مزید مؤثر بنانے کے لئے اپنی ترمیم ۱۹۶۳ء میں کہا (پ - اراکین کی اکثریت (نہ کہ صرف چار) ایسے اشخاص پر مشتمل ہوجن میں سے ہر ایک کم از کم پندرہ سال تک کسی معروف و معتمد تعلیمی ادارے میں افتاء یا تفسیر حدیث اور فقہ کی تدریس یا اسلامی تحقیق کا کام انجام دے چکا ہو) مولانا غلام غوث نے کم از کم پانچ ارکان مولانا ازہری مولانا ذاکر مولانا محمد علی نے کم از کم دو تہائی، مولانا نورانی پروفیسر غفور وغیرہ نے کم از کم نصف ارکان کا ذکر کیا تھا۔ مولانا عبدالحق مدظلہ نے کونسل میں علماء ارکان کو اکثریت میں رکھنے پر اتفاق نہیں کیا بلکہ باقی تمام ارکان کے لئے بھی ایسی اہم کونسل میں لازمی شرائط کے طور پر یہ اضافہ اپنی ترمیم ۱۹۷۷ء کے ذریعہ کرانا چاہا کہ فقہ پے کے بعد یہ نئی شق بڑھا دی جائے کہ کونسل کے تمام ارکان کو اپنے گریڈ اور دیپاداری کے لحاظ سے مسلمانوں میں قابل احترام حیثیت حاصل ہو) یہ ترمیم تو نہ پاس کی گئی مگر یکم اشرف عباسی نسیم جہاں کی ترمیم پر ایک خالص علمی اور تحقیقی کونسل میں ایک خاتون رکن کا اضافہ کر لیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ چیز آئینی کمیٹی میں بھی زیر بحث آئی تھی اور علماء کی مخالفت پر وزیر قانون نے اسے واپس لے لیا تھا۔ مگر آج رہی سہی کسر اس طرح بھی پوری کر دی گئی۔

عورتوں کی آزادی کے لئے اپنا جیسی بیگمات کیا کچھ کرتی ہیں۔ کیا وہ اسلامی احکام کے بارہ میں غلطانہ رویہ اختیار کر کے کونسل کو حیا و عفت سے متعلق اسلامی قوانین نافذ کرانے کا موقع دے سکیں گی جبکہ اس طرح انکی آزادی اور اباحت لازماً متاثر ہوتی ہے۔ کسی ایسی کونسل میں عورتوں کی نمائندگی کی مثالیں ہماری تاریخ میں کم ہی مل سکیں گی۔

۷۔ کی اصلاح | کونسل کو جواب بھیجنے کی مدت متعین نہیں کی گئی، مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۹۸۸ء میں کہا کہ یہ مدت تین ماہ سے زیادہ نہ ہو۔ دفعہ ۲۳ کے ذیل ۷۔ میں اسلامی کونسل کے لئے موجودہ قانون کو اسلامی سانچے میں ڈھانسنے کی مدت کا ذکر ہے کہ وہ اپنے تقرر سے سات سال کے اندر حتمی رپورٹ پیش کرے گی، مولانا عبدالحق نے ترمیم ۱۹۹۷ء کہ یہ کام سات سال کی بجائے موجودہ قومی اسمبلی کی ميعاد اختتام پر درج کیا جائے تاکہ موجودہ اسمبلی عوام کی طرف سے عائد شدہ فرم کی ادائیگی سے اپنی مدت تباہت میں سبکدوش ہو سکے۔ اور مذکورہ مدت میں بھی کمی آجائے۔

مولانا نورانی، پروفیسر غفور وغیرہ کی مشترکہ ترمیم ۱۹۹۷ء میں سات سال کی بجائے چار سال مولانا انصاری کی ترمیم میں پچھ سال اور پی پی پی کے پروفیسر غلام زہرول تارڑ صاحب کی ترمیم ۱۹۹۹ء میں سات کی بجائے دو سال پر زور دیا گیا تھا۔ اس دفعہ میں کونسل کو ہر سال منہی رپورٹ اور سات سال کے بعد

آخری رپورٹ پیش کر سنے کا تو ذکر تھا مگر یہ کہ اسمبلی کتنی مدت میں قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنانے کے کام کو مکمل کرے گی اس کی کوئی ضمانت نہ تھی نہ مدت کا تعین تھا۔ اندیشہ تھا کہ پچھلی کونسلوں کی سفارشات اور تحقیقاتی کاموں جیسا ستر اس قسم کی رپورٹوں کا بھی نہ ہو جائے، کیونکہ بغیر اس ضمانت کے کوئی گرفت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سبب اختلاف کی متفقہ ترمیم میں کہا گیا کہ آخری رپورٹ کے دو سال کے اندر کونسل کی تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کرنے کا کام لازماً ختم کر دیا ہے۔ یہ متفقہ ترمیم مفاہمت کی ضمن میں منظور کر لی گئی اور اس طرح اسمبلیوں پر ایک حد تک تعین مدت میں پابندی آگئی۔

کونسل میں مختلف مکتب فکر کو نمائندگی کا ذکر بھی ہے۔ اس کے بارہ میں علماء نے ترمیم پیش کی کہ تعداد اور آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مناسب و متناسب نمائندگی حاصل ہوتا کہ پارلیمنٹ سے بھی کم کسی اقلیتی مکتب فکر کو اہل سنت کے سوا اعظم کی حق تلفی کا موقع نہ دے۔ اس مفاہمت کے دوران کسی وضع شدہ قانون پر بھی اسمبلی کے ازمرو غور کرنے کی ترمیم منظور کر دی گئی اور سوشلزم سے متعلق ذیلی دفعہ بھی حذف کر دی گئی۔

یہ اسلامی احکام سے متعلق حصہ کا مختصراً ذکر تھا۔ مجموعی حیثیت سے آپ ان ترامیم کی روشنی میں آئین کی اسلامی اور جمہوری حیثیت کے بارہ میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔ تاہم ان تمام آئینی مذاکرات، آئینی کمیٹی میں علماء ارکان کے مساعی، پہلی خواندگی میں ارکان اور علماء حق کی دینی اور جمہوری نقطہ نظر کی ترجمانی اور پھر بالآخر بانٹیکاٹ کی شکل میں آئینی جنگ اور بالآخر حکومتی پارٹی کے مقابلہ روتیر سے جو کچھ حاصل ہوا اس کے پیش نظر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ سچے تمام مساویہ کے مقابلہ میں یہ آئین بہتر ہے ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا گیا ہے اور آئینہ کوششوں سے اس نیم اسلامی نیم جمہوری نیم عوامی دستور کو مکمل اسلامی بنایا جاسکتا ہے۔ ایسے دستور پر اسی جذبہ مفاہمت، ملی اتحاد و ملت کی سالمیت کے تقاضوں کے پیش نظر ترمیم پیش کرنے والے ارکان نے بھی اصول ابلیس سمجھ کر دستخط ثبت کئے۔ یہ آئینی مساعی نہ تو پوری ناکام ہیں نہ پوری کامیاب کہلا سکتی ہیں۔ مگر تاہم مجموعی حیثیت سے ایک فائدہ خیلندہ کہ خداوند کریم نے اتنی بڑی اکثریت کے مقابلہ میں کافی حد تک کامیابی سے ان ترمیمات کی شکل میں قوم کے سامنے آئین کی ترمیم کی تکمیل کا ایک خاکہ رکھ دیا ہے یہ آئینہ لوگوں پر ہے کہ دستور پر ہے ان ارکان کی فکر ہی اور دماغی اصلاحی کرد کاوش کو ملحوظ رکھ کر آئین کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی مملکت کا جامع عادلانہ اسلامی آئین بنا سکیں۔ (جاری ہے)

واللہ یعلم الحق و بعد یہ سبب و سبیل۔